ڈاکٹر فرمان فتح پوری

ایک جہت نما صاحبِ قلم

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ڈاکٹر سلیم اختر الوقار پبلی کیشنز

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نئی مطبوعات

الوقار پبلی کیشنز
alwaqarpublications@hotmail.com

ڈاکٹر لعل علی

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

ایک جہت نما صاحبِ قلم

تصنیف:

ڈاکٹر سلیم اختر

الوقار پبلی کیشنز

پوسٹ بکس نمبر 7104 لاہور۔ پاکستان

E-mail:alwaqarpublications@hotmail.com

جملہ حقوق محفوظ

ناشر	سید وقار معین 0300-8408750 (042) 7249348
سال اشاعت	2004ء
طابع	گنج شکر پریس لاہور
قیمت	=/250 روپے

الوقار پبلیکیشنز

پوسٹ بکس نمبر 7104 لاہور پاکستان

E-mail:alwaqarpublications@hotmail.com

انتساب

شعبۂ اُردو کراچی یونیورسٹی کی اسسٹنٹ پروفیسر

ڈاکٹر عظمیٰ فرمان کے نام

جنھیں میں ننھی پروفیسر کہتا ہوں

ڈاکٹر سلیم اختر

ترتیب

پیش لفظ

① سب اچھا کہیں جسے

② قطرہ سے گہر ہونے تک

③ ابتدائی حالات اور خاندانی کوائف

④ ننھا دلدار

⑤ تعلیم اور تعلم

⑥ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: تنقیدی تناظر

⑦ غالب کی قدر شناسی

⑧ تذکرہ کچھ کتابوں کا

- اردو کی منظوم داستانیں
- اردو کی بہترین مثنویاں
- اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری
- اقبال سب کیلئے
- زبان اور اردو زبان

- ⊙ اردو املا اور رسم الخط
- ⊙ ادبیات و شخصیات
- ⊙ میر کو سمجھنے کیلئے

(9) ہم کہ شاعر نہ کہو

(10) ضمیمہ

- ⊙ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: نجی تعلیمی اور منصبی کوائف
- ⊙ بطور موضوع
- ⊙ کتابیات (فرمان فتح پوری)
- ⊙ حواشی

کتابیات

پیش لفظ

ڈاکٹر فرمان فتح پوری تحقیق وتنقید میں جس ممتاز مقام کے حامل ہیں، بطور خاص اس کی وضاحت کی ضرورت نہ ہونی چاہیے اور اسی سے میری مشکل کا آغاز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے بے تکلفانہ دوستی ہے، میں چاہتا تو ان کے بارے میں تاثراتی قسم کی کتاب گھڑ لیتا، جس میں کچھ دلچسپ واقعات ہوتے، لطیفے ہوتے، چٹکلے ہوتے یعنی چندرہ دن میں بارہ مصالحے کی چاٹ تیار ہو جاتی، مگر میں نے اس کے برعکس اس کتاب پر مہینوں مسلسل کام کیا یہ سوچ کر کہ علمی و ادبی شخصیت کو اس کے حقیقی تناظر ہی میں پیش کرنا چاہیے لہٰذا اپنی "میں" دبا کر صرف ڈاکٹر صاحب کی ذات وصفات کو اُجاگر کیا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے میری فرمائش پر اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں مفصل لکھ بھیجا، ڈاکٹر صاحب آپ بیتی لکھنے کا سوڈ بنا رہے ہیں جو یقیناً "یادوں کی برات" کے برعکس ہوگی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کی آپ بیتی کے اجزا کو ایڈیٹنگ کے بغیر مکمل طور پر استعمال کیا ہے، یہ سوچ کر کہ ایک تو مجھے ان کی خود نوشت میں قطع و برید کا حق حاصل نہیں اور دوسرے اس بنا پر کہ اگر وہ آپ بیتی نہ لکھ پائے تو اس کتاب کی صورت میں ان کی تحریر محفوظ رہ کر حوالہ کی چیز ثابت ہوگی بچپن کی یادوں کے بارے میں بھی ان کے دو مضامین مل گئے جو شامل کر لیے تاکہ ان کے مداحوں اور ادب کے قارئین کو یہ اندازہ ہو جائے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ستارۂ امتیاز جب سید دلدار علی تھا تو کیسا تھا؟

ڈاکٹر فرمان فتح پوری خود ساختہ انسان ہیں، ان کی زندگی مسلسل محنت سے عبارت ہے۔ چنانچہ ان کی زندگی کے اس پہلو کو بطور خاص اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ آج کے شہرت طلب بے چین ادیبوں کو اندازہ ہو جائے کہ شہرت گمشدہ شے یا مال مسروقہ نہیں۔ یہ خون جگر سے حاصل ہوتی ہے اور یہی سبق ڈاکٹر فرمان فتح پوری یا ان جیسے دیگر اصحاب کی زندگیوں سے ملتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری، متنوع موضوعات پر چالیس سے زائد کتابیں تحریر کر چکے ہیں، سب کا مفصل مطالعہ ممکن نہ تھا، ان کی چند نمائندہ کتابوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا۔ اس ضمن میں یہ امر بطور خاص ملحوظ رکھا گیا کہ محض تشریحی نوٹس لکھنے کی بجائے، کتابوں کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کی محققانہ مساعی اور انداز نقد اجاگر کیا جائے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری .... شاعر؟ ہے نہ باعث تعجب؟ قریبی دوستوں کے علاوہ عام لوگ ان کی شاعری سے ناواقف ہیں، نہ مجموعہ کلام چھپوایا نہ شاعروں کی سیاست میں ملوث ہوئے، شاعری خفیہ شوق ہے۔ اس لیے ان کی شاعری کے لئے پورا باب وقف کیا اور شاعری کی وافر مثالیں پیش کیں۔ کتاب میں پیش کردہ نمونہ کلام کی بنا پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر شاعری کو سنجیدگی سے لیا ہوتا تو یقیناً معروف شعراء میں شمار ہوتے۔ چلیں اس کا یہ فائدہ تو ہوا کہ اب ڈاکٹر صاحب پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ یہ تخلیقی کرب سے ناآشنا نقاد ہیں۔

میں نے ہر ممکن طریقے سے محقق، مفکر اور نقاد کے پیچھے چھپے اچھے انسان، مخلص دوست، بے ریا فرد، دلچسپ شخصیت اور محقق ادیب کے نقوش اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، میں اس میں کس حد تک کامیاب رہا، اس کا فیصلہ قارئین کے ہاتھ میں ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر

① ''سب اچھا کہیں جسے!''

سوال: مالک رام، نیاز فتح پوری، سید وقار عظیم، رشید حسن خان، احمد ندیم قاسمی، جمیل الدین عالی، مشفق خواجہ، خلیق انجم، محمد علی صدیقی، امراؤ طارق، طاہر تونسوی اور نجیب جمال میں کیا قدر مشترک ہے؟

جواب: متعدد اہل علم کی مانند یہ بھی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے غیر مشروط مداح ہیں۔

سوال: کیوں؟

جواب: اس لیے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شخصیت ایسا علمی گھاٹ ہے جہاں تشنگان ادب اپنی پیاس بجھاتے ہیں شعر و نقد کا کوئی بھی مسئلہ ہو، تحقیقی مباحث کا کیسا ہی تیز حازاویہ کیوں نہ ہو.... ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ذہن رسا عقدہ کشائی کو موجود کلاسیکی ادب اور تحقیقی شخصیات کے بارے میں در تحقیق باز کر رہے ہوں یا جدید ادبی تحریکات کے حسن و قبح کی پرکھ کا معاملہ ہو یہ سب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی قلم رو میں ہیں.... نصف صدی کی قلمی مساعی کے باوجود آج بھی خامہ نخل رطب فشاں ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ ان کے ساتھی قلم کاروں اور معاصرین میں سے خامے یا تو تھک گئے ورنہ گرد راہ ثابت ہوئے مگر ہنوز ذہنی لحاظ سے فعال ڈاکٹر فرمان فتح پوری قلم کا دھنی اور گفتار کا غازی ہے........ صف دشمناں میں بھی اور حلقۂ یاراں میں بھی۔

سوال: کچھ اور بھی وجوہ ہیں؟

جواب: ماضی کی ادبی تاریخ ہو یا حال کا تخلیقی منظر نامہ...... شادوولوں کے سروں پر شہرت کے بڑے عمامے سجائے گئے اور بگھیر نے زر خرید یا مستعار بیساکھیوں کے ذریعہ خود کو نمایاں کیا اب ادب کی منڈی میں ہر نوع کی بیساکھیاں موجود ہیں بصورت قلم اور کالم، بصورت قصیدہ خواں اور دشنام طراز، بصورت گروہ اور گروپ........ الغرض! کھولی ہے دوکاں سب سے الگ.... کے مصداق حصول شہرت اور مبینہ دشمنوں کی کردار کشی کے لئے قلم فروشوں کے پاس ہر طرح کا اسلحہ

دستیاب ہے مگر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے حصول شہرت کے لئے یہ منفی حربے نہ اپنائے، نہ گروپ بندی کی، نہ کبھی چمچے اور گرگے پالے...... خانہ نشین ہو کر محنت اور لگن سے کام کیا، جس کا یہ اجر ملا کہ آج صرف پاکستان اور ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ اردو دنیا میں ان کا نام عزت اور محبت سے لیا جاتا ہے اور معقول محققین اور معتبر ناقدین میں شمار ہوتا ہے۔

سیاسی شہرت کے برعکس قلم کی شہرت کی اساس ذہنی صلاحیتوں، مزاج کی اپج، وسیع مطالعہ اور شخصیت میں جدت وندرت کے جوہر پر استوار ہوتی ہے اور واقعی...... ایں سعادت بزور بازو نیست والی بات ہی ہے۔ ذہنی صلاحیتیں اور محنت وریاضت شہرت کے خلعت فاخرہ میں تانے بانے کا کام کرتی ہیں، اسی لئے ''مشہور'' شخصیات کو دیکھیں تو کسی کسی پر ہی جامۂ شہرت فٹ نظر آتا ہے تو کسی پر کھلا۔ ہر کسی پر یہ بجتا ہی نہیں۔ اسی لئے کسی پر جامۂ شہرت تنگ نظر آتا ہے تو کسی پر کھلا...... جو مستعار ہونے کا بھانڈا پھوڑ رہا ہوتا ہے، مگر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ایسا معاملہ نہیں، انہوں نے محنت وریاضت سے کام کیا، مسلسل کام کیا اور ہنوز بھی کام میں مشغول پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے شہرت شارٹ کٹ سے نہیں حاصل کی یہ ان کی سعی مسلسل کا ثمر ہے۔ اس لئے یہ شہرت ''انسٹنٹ کافی'' کے برعکس، دیرپا ثابت ہوگی کہ محنت کے ساتھ ساتھ اس کی فکری اساس بھی مستحکم ہے۔

سوال: بس یا اور بھی کچھ کہنا ہے؟

جواب: ذکر اس پری وش کا...... شاید مصرع حسب حال نہ ہو مگر بے حقیقت...... ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شخصیت میں نام کی مناسبت سے دلداری کے جملہ خصائص ملتے ہیں، اہل قلم کا بھی عجب معاملہ ہے کہ قریب آنے پر بالعموم ان کی تخلیق کا گلیمر اور شہرت کی چمک جھوٹی ثابت ہوتی ہے، گویا کوتاہ قد کی اکلا جمنٹ دیکھ رہے ہوں اس لئے بعض کا شاعرانہ کلام اور عام گفتگو چھوٹا منہ اور بڑی بات ثابت ہوتی ہے مگر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی قلمی شخصیت اور حقیقی شخصیت میں کسی طرح کا بعد نہیں ملتا جیسے وہ اپنی تحریروں میں روشن خیال نظر آتے ہیں ویسے ہی انکی شخصیت اجلی اجلی سی

ہے۔ خوش خصال اور خوش گفتار ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے جو دل میں ہے وہی زبان پر اور قلم بھی وہی لکھتا ہے۔ ادیبوں کے قبیلہ میں نقاد غریب کی جورو سمجھا جاتا ہے، ہر ادیب اس سے توصیفی مقالات کا طالب ہوتا ہے لطیفہ یہ ہے کہ تعریف پر بھی بالعموم ادیب ناخوش ہی رہتے ہیں کہ تنقید کی دال میں تعریف کا تڑکا کم کیوں لگایا! اس لئے بیشتر ناقدین متنازعہ ثابت ہوئے ہیں لیکن کمال ہے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا کہ نقاد بھی ہیں، مقبول بھی ہیں اور غیر متنازعہ بھی اور کسی وجہ سے نہ سہی صرف اسی پینتکاری کی وجہ سے ہی لائق توصیف قرار پائے ہیں۔

سوال: اور کچھ؟

جواب: آخری بات! ہمارے ہاں جس طرح سے سیاسی اثر ورسوخ، پبلک ریلیشنگ یا حکمرانوں کی عنایات خسروانہ کی وجہ سے ایوارڈ انعامات اور تمغے ملتے ہیں ان کی وجہ سے اب یہ کاروبار باعث عزت نہیں رہا۔ یہ ہمارے مخصوص سیاسی اور سماجی حالات کے پیدا کردہ تضادات کا نتیجہ ہے کہ اب شہرت، دولت اور منصب اور اقتدار حاصل ہونے کے باوجود بالعموم عزت، محبت اور احترام نصیب نہیں ہوتا۔ اسی لئے میں امیر یا مشہور کے مقابلہ میں عزت دار کی عزت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور اس کڑے معیار پر بھی ڈاکٹر فرمان فتح پوری پورے اترتے ہیں کہ باعزت مشہور شخصیت ہیں۔ ذاتی طور پر میں تمغوں کے بجائے شخصیت پر لکھے گئے مقالات اور کتابوں کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں کہ یوں اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون کیا کہہ رہا ہے؟ اگرچہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ستارۂ امتیاز (۱۹۸۵ء) بھی حاصل کر چکے ہیں لیکن میری نظر میں اصل اہمیت ان مقالات کی ہے جو ان کی ذات اور ادبی کمالات کے بارے میں قلم بند کئے گئے اور اعزازات کے مقابلہ میں ان کتابوں کو میں زیادہ قدر افزائی گردانتا ہوں جو ان کے بارے میں مرتب کی گئیں۔ ہمارے ہاں صاحب حیثیت شوقین ادیب ایسی کتابیں مرتب کروا کر اپنے پلے سے چھپواتے، مفت تقسیم کرتے اور تقریبات منعقد کراتے ہیں مگر فرمان صاحب کے بارے میں جو کتب مرتب کی گئیں یہ بربنائے محبت تھیں مرتبین کا مقصد صرف ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو ہدیہ خلوص پیش کرنا تھا ان سے ذاتی منفعت

کا حصول نہ تھا ملاحظہ کیجئے:

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: حیات وخدمات (تین جلدیں)

مرتبہ: امراؤ طارق۔ کراچی: ۱۹۹۳ء

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: احوال وآثار

مرتبہ: ڈاکٹر طاہر تونسوی لاہور: ۱۹۹۸ء

۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: شخصیت اور ادبی خدمات

مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم دہلی: ۱۹۹۱ء

۴۔ کتاب سے پہلے (مطبوعات ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے منتخب دیباچے)

مرتبہ: ڈاکٹر نجیب جمال۔ لاہور: ۱۹۹۳ء

ان مرتبہ کتابوں میں ۱۷۵ کے قریب اہل علم کے مقالات، خاکے اور تاثراتی مضامین ہیں۔ ان پر مستزاد مرتبین کے دیباچے، مشاہیر ادب کی آراء، شعراء کا منظوم خراج عقیدت اور فرمان صاحب سے انٹرویوز!

''ہم طبعاً قبر پرست ہیں اسی لئے زندگی میں سنگ زنی کرتے اور مرنے کے بعد قبر بنا کر مجاور بن بیٹھتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کی مجاوری نے تو اب ایک پیشہ کی صورت اختیار کر لی ہے، دیگر شعراء اور اہل علم کے مجاور بھی دستیاب ہیں، ایسے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی زندگی ہی یہ توصیف قابل توجہ بھی ہے اور قابل قدر بھی..... کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا! ڈاکٹر فرمان فتح پوری بنیادی طور پر نثر نگار ہیں اور مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ ان کی نثر میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو اچھی نثر کا طرۂ امتیاز ہو سکتی ہیں۔ ان کی زبان میں ثقالت نہیں ہے''

مالک رام (۱)

''ڈاکٹر فرمان فتح پوری یوں تو ادب کی قریب قریب تمام اصناف پر ماہرانہ عبور رکھتے ہیں لیکن صنف رباعی، جو میرے نزدیک سب سے مشکل صنف ہے، اس کا مطالعہ انہوں نے خصوصیت کے ساتھ بڑے شوق اور محنت سے کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صنف رباعی کا کوئی تاریخی یا فنی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر انہوں نے کامل غور نہ کیا ہو یا اس پر پوری تحقیق نہ کی ہو اور اس غور و تحقیق کا نتیجہ یہ کتاب ہے جسے میں ہر لحاظ سے قدر اول کی تصنیف خیال کرتا ہوں''

نیاز فتح پوری (۲)

''فرمان صاحب کے تحقیقی مضامین نے منطق کے اسی انداز پر چل کر کئی ایسی باتیں دریافت کی ہیں جنہیں ادب کی دنیا میں اعتبار کا درجہ ملا ہے۔ منطق کے جن مرحلوں کا ذکر میں نے ابھی ان تحقیقی مضامین کے سلسلے میں کیا ہے ان میں بڑی سبک رفتاری، ابھرنے اور آگے بڑھنے والی تمثیل کی کیفیت ہے جو شوق اور تجسس کو ابھارتی، ذہن کو شک و یقین کے زیر و بم سے گزارتی، ایک ایسے انجام تک پہنچتی ہے جو ہر پڑھنے والے کے لئے قابل قبول ہو''۔

وقار عظیم (۳)

''وضع داری ایک ایسا لفظ ہے جس کا مفہوم لغت میں بھی صحیح طور پر درج کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے اور ہماری زندگی میں تو وہ ''بیگانہ آشنا'' بن کر رہ ہی گیا ہے۔ اس میں حالات کے جبر کو بھی دخل ہے اور کم ظرفی کو بھی، یہ تو ممکن ہے کہ لغت نویس کی حیثیت سے اس لفظ کے وسعت مفہوم کو لفظوں میں اسیر نہ کر پائیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کی

شخصیت اسی لفظ کی قد آدم آئینہ دار ہے۔اس کی کارفرمائی ان کے مزاج کا جزو اور طبیعت کا تقاضا ہے مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوشش کر کے بھی اپنے آپ کو اس کے تقاضوں سے بے تعلق رکھنے پر قابو یافتہ نہیں ہو پائیں گے۔ عادت ہو تو بدل جائے فطرت کو کون بدل سکتا ہے"۔

رشید حسن خان (۴)

"ایسا اتفاق کم ہی ہوا ہے کہ کوئی محقق اور نقاد دس نہیں بلکہ پوری چالیس کتابوں کا مصنف ہو اور ان میں سے ہر کتاب معیاری ہو کوئی تصنیف ایسی نہ ہو جس کے بارے میں یہ شبہ تک بھی نہ گزرے کہ اسے رواداری میں لکھا گیا یا ضرورتاً لکھا گیا یا مصلحتاً لکھا گیا۔ادیب کی ہر تحریر معیاری نہیں ہوتی، کہیں نہ کہیں اس سے کوئی نہ کوئی کمزوری سرزد ہو جاتی ہے مگر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی حیثیت اس لحاظ سے منفرد ہے کہ ان کی ہر تصنیف ان کمزوریوں سے مبرا ہے یوں کہیں کہ ان میں کمزور چیز لکھنے کی "صلاحیت" ہی نہیں ہے..... میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو اس دور کا ایک ایسا نابغہ قرار دوں گا جن کے ہاں علم و حکمت اور شعر و فن کی تمام خوبصورتیاں مجسم ہو گئی ہیں۔"

احمد ندیم قاسمی (۵)

"پیغمبروں، صحابۂ کرام اور آئمہ معصومین کے علاوہ ہم عام انسان خطاؤں کے پتلے ہوتے ہیں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کسی نہ کسی شعبے میں کسی نہ کسی خطا کے مرتکب ہوئے ہوں گے مگر اب ترازو کے جھکاؤ کا سوال آتا ہے۔ مجھے وہ پلڑا بہت ہی بھاری لگ رہا ہے جس میں ان کو رکھا

ہے اور وہ بہت ہی ہلکا ہے جس میں خواہ ٹھوس معلوم، خواہ قیاس اور نامعلوم کمزوریوں کو..... اور یہ کتنی بڑی بات ہے"

جمیل الدین عالی (۶)

"ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ذات میرے لئے کئی وجوہ سے دامن کش دل ہے۔ ان کی علمی فتوحات پر نظر ڈالیے تو ایسا لگتا ہے جیسے ایک دریا ہے جو بہہ رہا ہے۔ اس دریا سے کئی نہریں نکلتی ہیں۔ ایک طرف تحقیق کی جوئے خوش خرام ہے جو سنگلاخ راستوں سے گزرتی ہوئی بنجر زمینوں میں گل گلزار کا سماں پیدا کر رہی ہے۔ دوسری طرف تنقید کی آبجو ہے جو موج خرام یار کی طرح عجیب گل کتر رہی ہے۔ لغات، قواعد، لسانیات اور دوسرے بہت سے علوم کی نہریں بھی الگ الگ سمتوں میں رواں ہیں اور تشنہ لبوں کی پیاس بجھا رہی ہیں"۔

مشفق خواجہ (۷)

یہ صرف چند آراء ہیں مگر ایسی کہ مسلسل پڑھنے سے بذات خود ایک مضمون میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اسی سلسلہ میں مزید مطالعہ کے لئے عبدالرحمٰن ناصر کے مقالے "ڈاکٹر فرمان فتح پوری: مشاہیر کی نظر میں" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے تینتالیس اہل علم کی خوبصورت آراء سے آراستہ یہ مقالہ "ڈاکٹر فرمان فتح پوری: حیات و خدمات" مرتبہ امراؤ طارق جلد سوم میں شامل ہے۔

② ''قطرہ سے گہر ہونے تک''

بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

''سلسلۂ نسب کو، اپنی تعلیم و تربیت کو، اپنے اطوار و عادات کو اپنے ذوق و شوق کو اور اپنے مزاج و افتادِ طبع کو بیک وقت سامنے دیکھ کر، جب میں اپنے بارے میں غور کرتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ میں:

فطرتاً آدمی ہوں

تادیباً انسان ہوں

مذہباً مسلمان ہوں

نسباً سید ہوں

مسلکاً حنفی ہوں

مشرباً بریلوی ہوں

عقیدۃً موحد ہوں

ذوقاً شاعر ہوں

مزاجاً صوفی ہوں

اپنے بارے میں میرا اس طرح کا احساس اور خاص کر اس وقت جبکہ میں خود زندگی کے آخری موڑ کے قریب پہنچ رہا ہوں، شاید اس وجہ سے ہو کہ میں نے اپنی زندگی میں اگر کسی شخص یا شخصیت کا کوئی اثر قبول کیا ہے تو وہ مولانا حسرت موہانی اور ان کی شخصیت کا ہے''۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے بارے میں بس یہ نہیں کہا کہ عادتاً عاشق بھی ہوں، باقی سب کچھ کہہ ڈالا اور جو کچھ کہا یہ ان کی ناقدانہ شخصیت کو سمجھنے میں خاصہ ممد ثابت ہوتا ہے۔ ایک روشن خیال دانشور کے طور پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو خصوصی شہرت حاصل ہے اسی طرح بنیاد پرستی اور

ملائیت کے خلاف ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ذہنی رویہ سے بھی سبھی آگاہ ہیں، مسلمات سے انحراف کا یہ رویہ صوفی ہونے کے باعث ہے جبکہ ''موحد'' ہونا انہیں غالب کی ذہنی فضا کے آس پاس کر دیتا ہے، جس کے بقول:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

حسرت موہانی کے اثرات کا تو ڈاکٹر صاحب نے خود بھی اعتراف کیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آزاد خیالی پر مبنی مسلمات سے انحراف کا رویہ نیاز فتح پوری سے قربت کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے، جس کا ''نگار'' وہ مسلسل نکال رہے ہیں اور حلقہ نیاز و نگار (کراچی) کے زیر اہتمام پاکستان اور ہندوستان کے معروف اہل علم، اہل قلم اور اہل دانش کے تحریر کردہ علامہ نیاز فتح پوری یادگاری خطبات کا سلسلہ جاری کئے ہوئے ہیں۔

اس سلسلہ کی اولین تقریب ۱۹۸۳ء (کراچی) میں فیض احمد فیض کی زیر صدارت منعقد ہوئی تھی۔ یادگاری خطبات کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اکتیس اہل دانش کے خطبات پر مشتمل ڈاکٹر صاحب کی مرتبہ کتاب ''نیاز شناسی'' (کراچی: ۱۹۹۷ء) طبع ہو چکی ہے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی نظریہ، تصور، یا کاز سے ایسی گہری وابستگی یوں ہی نہیں پیدا ہوتی بلکہ اس کے سوتے شخصیت کی گہرائیوں سے پھوٹتے ہیں اور ان شخصیات کے مثبت یا منفی اثرات بھی اس میں رنگ آمیزی کرتے ہیں جن سے عرصہ حیات میں ہمارا سابقہ پڑتا رہتا ہے۔

نسبت نامہ:

معروف شخصیات اپنے کارناموں سے پہچانی جاتی ہیں لہذا باپ، دادا یا اولاد کی صرف ریکارڈ کی حد تک اہمیت ہوتی ہے ہاں! والدین یا اولاد کا جداگانہ تشخص ہو تو اور بات ہے یا پھر نفسیاتی لحاظ سے انہوں نے بچے کی شخصیت پر گہرے اثرات چھوڑے ہوں، تخلیقی شخصیت کی نشوونما کے لحاظ سے وہ قابل توجہ ہوں گے ورنہ بصورت دیگر نام اب ج د ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس طرح کسی شہر، مقام، نسل، ذات، مسلک، قبیلہ اور شخص سے تعلق کا اظہار محض چھوٹی سی تعلی ہے اصل اہمیت ذات وصفات کی ہے۔

ہماری سماجی روایات میں ہنوز حسب نسب کو بہت اہمیت دی جاتی ہے اگرچہ پدرم سلطان نہ بود مگر انداز افتخار کچھ ایسا ہی ہوتا اسی لئے خاندان اور ذات برادری سے باہر شادی نہیں کی جاتی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے حسب ونسب کے سلسلہ میں غالباً تمہید مناسب نہیں مگر خود ڈاکٹر صاحب کے اپنے خیالات بھی کچھ ایسے ہی ہیں وہ اس ضمن میں اپنی خود نوشت میں رقم طراز ہیں:

> ''فکر ونظر کے اعتبار سے آج کل کی دنیا اتنی بدلی ہوئی ہے بلکہ اتنی آگے نکل گئی ہے کہ حسب نسب یا خاندانی سلسلے کا ذکر چھیڑنا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ بعض کے نزدیک یہ ذکر غیر مستحسن قرار پائے لیکن چونکہ مجہول النسب یا اپنی اصل ونسل سے مفقود الخبر ہونا بھی کوئی مستحسن وممدوح بات نہیں ہے بلکہ مشرق میں تو ایسا ہونا ابھی تک گالی اور دشنام کے برابر ہے، اس لئے اپنی سوانح کے سلسلے میں مختصراً اپنے حسب نامے یا خاندان کا ذکر غیر ضروری نہیں، بلکہ ضروری وبامعنی معلوم ہوتا ہے۔''

خاندان کے بزرگوں سے جو کچھ میں نے سنا ہے، مختلف خاندانی شجروں اور

یادداشتوں کے ذریعے جو کچھ مجھ تک پہنچا ہے، سرکاری وغیر سرکاری دستاویزوں میں مجھے جو کچھ لکھا نظر آیا اور مختلف کتابوں کے مطالعے سے جو کچھ مجھے مل سکا ہے اس کی روشنی میں میرا شجرۂ نسب کچھ اس طرح مرتب ہوتا ہے۔

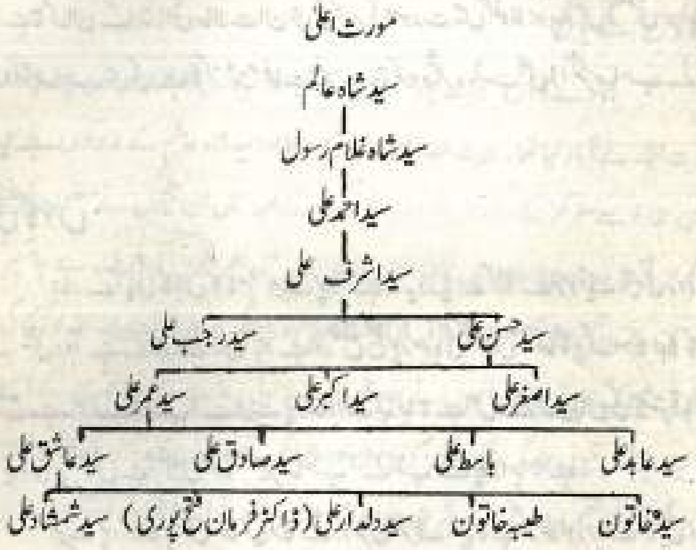

اس شجرے کو سامنے رکھ کر اگر میں اپنا نام کنیت کے ساتھ عربوں کے طریقے سے لکھوں تو یوں لکھنا ہوگا:

سید دلدار علی (ڈاکٹر فرمان فتح پوری) ابن سید عاشق علی ابن سید عمر علی ابن سید حسن ابن سید اشرف علی ابن سید احمد علی ابن سید شاہ غلام رسول ابن سید شاہ عالم۔

③ ابتدائی حالات اور خاندانی کوائف

میری درخواست پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے ابتدائی حالات اور خاندانی کوائف عنایت کئے کیونکہ یہ غیر مطبوعہ مواد ڈاکٹر صاحب کے قلم سے ہے اس لئے ایڈیٹنگ کے بغیر پیش کیا جارہا ہے تاکہ ان کے ابتدائی حالات ان ہی کی تحریر کی صورت میں محفوظ ہو جائیں (ضمنی سرخیاں بھی ڈاکٹر صاحب ہی کی ہے) گزشتہ صفحات میں درج کردہ شجرہ نسب بھی ڈاکٹر صاحب نے ہی مہیا کیا ہے۔

آبائی گاؤں

ہمارے آبائی گاؤں کا نام "ہیت پور" ہے۔ یہ دریائے گنگا سے نزدیک جی ٹی روڈ کی طرف یعنی دوآبے کے علاقے میں آباد ہے اور ضلع فتح پور ہسوہ کی تحصیل "کھاگا" پرگنہ ہتگام کا چھوٹا سا موضع ہے۔ عرف عام میں اسے ہیت پور سادات کہا جاتا ہے اس لئے کہ یہاں کی بیشتر آبادی حنفی سیدوں پر مشتمل ہے جنھیں عموماً "میر صاحب" کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔

ہیت پور کے بالکل مقابل گنگا کے دوسری طرف، پرتاب گڑھ اور رائے بریلی کے اضلاع ہیں۔ پرتاب گڑھ کے قصبات میں کالا کانکر، نواب گنج، بیر انگر اور سلون شریف وغیرہ ہیت پور سے چند میل کے فاصلے پر ہیں درمیان میں صرف گنگا حائل ہے۔ پرانی رشتہ داریاں بھی ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سلون، بیر انگر اور ہیت پور کے سید خانوادے یک جدی ہیں اور ان کے مورثان اعلیٰ نے مغلوں کے ابتدائی دور میں بخارا سے دلی کا رخ کیا تھا۔ ان حقائق کی تفصیلات، نجم الغنی کی تاریخ اودھ، سلون، بیر انگر، کڑہ مانکپور، ارایاں، شاہ پور اور ہرہ کی تاریخی دستاویزوں کے علاوہ فتح پور، پرتاب گڑھ اور رائے بریلی کے ان گزیٹئرز میں بھی محفوظ ہیں، جنھیں انگریزوں نے اپنی انتظامی ضرورتوں کیلئے بڑی جانفشانی و تحقیق سے مرتب کرایا تھا لیکن مجھے حسب نسب کی شان و شوکت یا جاہ و جلال سے زیادہ دلچسپی کبھی نہیں رہی اس لئے زیادہ تفصیل میں نہ جاؤں گا۔

صرف وہ باتیں مختصراً عرض کروں گا جو براہ راست میرے مطالعے میں رہی ہیں اور جن کا بیان کرنا یوں ضروری ہے کہ مسلمانوں کے یہاں علم الانساب یعنی حسب نسب کی تاریخ کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور کسی کا ناقص الحسب و مجہول النسب ہونا معیوب ہی نہیں ایک طرح کی گالی سمجھا جاتا ہے۔

گاؤں کے بانی

ہمارے گاؤں "ہیت پور" کو جیسا کہ نجی اور سرکاری کاغذات سے پتہ چلتا ہے شاہ ہیت اللہ نے آباد کیا تھا۔ ہیت اللہ شاہ، شاہ نعیم عطا اور سید شاہ عالم کے بزرگوں نے عہد مغلیہ میں بخارا سے سفر کر کے دلی میں قیام کیا تھا۔ بعد کے عہد میں ان تینوں نے مغلوں کی فوج میں گراں قدر خدمات انجام دیں نتیجتاً انہیں انعام میں مغل حکمرانوں کی طرف سے جاگیریں عطا ہوئیں۔ شاہ نعیم عطا کو سلون کا علاقہ ملا سید شاہ عالم کو بیر انگر کا، اور شاہ ہیت اللہ کو گنگا کی دوسری طرف کا ایک علاقہ ملا جسے انہوں نے بعد میں اپنے نام کی رعایت سے ہیت پور کے نام سے آباد کیا۔ پہلے یہ تینوں بزرگ ایک جگہ یعنی سلون اور بیر انگر کے علاقوں میں مقیم تھے پھر سید شاہ عالم نے بیر انگر کو، شاہ نعیم عطا نے سلون شریف کو اور شاہ ہیت اللہ نے اپنے نام کی نئی بستی ہیت پور کو مستقلاً اپنا مسکن بنایا لیکن باہم ملنے جلنے کا سلسلہ برابر یوں قائم رہا کہ یہ سارے علاقے ایک دوسرے سے بہت قریب تھے بلکہ ملحق تھے اور آمد و رفت میں کوئی دشواری نہ تھی۔

مورثِ اعلیٰ

شاہ ہیت اللہ نے اپنی ساری جاگیر شاہ جہاں کے زمانے میں اپنی ازواج و دختران میں تقسیم کر دی۔ اس تقسیم کے کاغذات آج تک ہمارے خاندان میں محفوظ ہیں۔ ان پر عہد شاہجہانی اور عہد عالمگیری کی مہریں ثبت ہیں۔ جب شاہ ہیت اللہ نے ہیت پور میں پوری طرح قدم جما لیے تو بیر انگر یعنی گنگا کے اُس پار کے حضرت شاہ عالم کے سجادہ نشین اور فرزند جناب شاہ غلام رسول بھی ہیت پور آ گئے۔ بتایا جاتا ہے کہ سید شاہ عالم، شاہ نعیم عطا اور شاہ ہیت اللہ تینوں ہم

مشرب وہم نسب تھے۔ راہ طریقت سے الگ شرعاً ان کا ایک دوسرے سے کیا حقیقی رشتہ تھا اس کا صحیح علم نہ ہو سکا لیکن خاندانی دستاویزوں اور سرکاری کاغذوں سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ سید شاہ عالم ہمارے مورث اعلیٰ تھے اور ان کے فرزند اور سجادہ نشین جناب شاہ غلام رسول نے بیر انگر سے آکر جیت پور کو اپنا مستقل مسکن بنالیا تھا۔ ان کے بعد کا سلسلہ نسب ہمارے خاندان کے سارے بزرگوں کو ازبر تھا۔ مجھے بھی پوری طرح یاد ہے اور اس کی تصدیق زمینداری کے ان سرکاری کاغذات سے بھی ہوتی ہے جو خاندان کے ساتھ ساتھ محکمہ مال میں ہنوز محفوظ ہیں اور آج بھی انہی کے مطابق کھیت کھلیان اور باغات کی پیداوار کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔

موروثی جائیداد کی تقسیم

حضرت شاہ غلام رسول کے تین بیٹے تھے۔ سید زید علی، سید الٰہی بخش اور سید احمد علی۔ سید زید علی سے انور علی ہوئے اور انور علی سے سرور علی، سرور علی لاولد رہے۔ میں نے سرور علی کو اپنے بچپن میں دیکھا ہے الٰہی بخش سے سید محمد حسن ہوئے محمد حسن سے صدیق حسن ہوئے، صدیق حسن کو میں نے دیکھا ہے اور ان سے بہت کچھ سیکھا ہے، میرے والد سے عمر میں چند سال چھوٹے تھے۔ اردو فارسی اور ہندی بہت اچھی جانتے تھے۔ انگریزی سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ چند سال ہوئے انتقال کیا ہے۔ شاعری سے خاص ذوق تھا، حضرت نوح ناروی کے شاگرد جناب عبدالرؤف رسوا کے شاگرد تھے اور زیادہ تر نعتیں کہتے تھے۔ میں نے اپنی نوعمری میں ان بزرگوں کو دیکھا ہے، ان کے ساتھ بیٹھا ہوں، ان کے اشعار سنے ہیں اور یہ باتیں میرے لئے تربیت ذوق کا وسیلہ بنی ہیں۔ سید صدیق حسن صاحب کے نام میری ایک کتاب "تحقیق و تنقید" کا انتساب بھی ہے۔ ان کے بڑے بیٹے سید واحد علی یوپی پولیس میں انسپکٹر تھے۔ سبکدوش ہوکر کولہن ٹولہ الٰہ آباد میں رہنے لگے ہیں۔ واحد علی کے چھوٹے بھائی سید نظیر الحسن اپنے علاقے کے پردھان رہ چکے ہیں۔ گاؤں میں رہتے ہیں اور زمینداری دیکھتے ہیں۔ ان کو میری بہن طیبہ خاتون بیاہی تھیں۔

۱۹۸۹ء میں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ سید واحد علی کے ایک اور چھوٹے بھائی تھے عزیز الحسن وہ جواں سالی میں ہی وفات پا گئے۔ میری بہن زوجہ نظیر الحسن کے دو بیٹیاں صفیہ اور اصفیا اور تین بیٹے ہیں۔ بڑے مبین الحق ایڈووکیٹ ہیں، افسر میاں اپنے والد کی جگہ گاؤں میں پردھان اور رئیس بھی انہیں کے ساتھ رہتے ہیں۔ رئیس میاں ذہنی طور پر معذور ہیں سید واحد علی کے کوئی اولاد نہیں ہے میرے بھانجے مبین الحق عرف سردار میاں ایڈووکیٹ کو گود لیے ہوئے ہیں۔

احمد علی کی پشت میں

احمد علی کے صرف ایک صاحبزادے تھے ان کا نام سید اشرف علی تھا۔ اشرف علی کے دو بیٹے تھے رجب علی اور حسن علی۔ رجب علی سے ہوئے سید برکات علی اور سید رونق علی۔ سید برکات علی کے اکلوتے بیٹے سید خیرات علی پچھتر سال سے اوپر ہیں، ابھی حیات ہیں۔ ان کے پانچ بیٹے ہیں۔ بڑے بیٹے سید لیاقت علی نے فتح پور شہر میں گھر بنوالیا ہے وہیں رہتے ہیں۔ شروع سے سیاست میں دلچسپی رکھتے ہیں شہر کے ممتاز وکیل ہیں، ہندوستان کی لوک سبھا (مرکزی پارلیمنٹ) کے ممبر اور صوبائی اسمبلی یوپی کے منتخب رکن اور وزیر رہ چکے ہیں۔ بہت ذہین محنتی اور انسان دوست سیاسی رہنما ہیں۔ وہ ضلع فتح پور کے پہلے مسلمان ہیں جو آزادی کے بعد ہندوستان میں سیاست وحکومت میں لوک سبھا کے رکن اور صوبائی وزیر ہوکر ابھرے، انہوں نے جو کچھ ترقی کی ہے اپنے دم قدم سے کی ہے اور ایک مثال قائم کی ہے۔ وہ ہندوستان میں سیاست و وزارت کے حوالے سے فخر خاندان کہلاتے ہیں اور اس لقب کے مستحق ہیں۔ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں اور میرے شاگرد بھی ہیں۔ رشتۂ قرابت سے قطع نظر میرے دوست جیسے ہیں اور میرا حد درجہ لحاظ کرتے ہیں میں بھی انہیں بہت عزیز رکھتا ہوں۔ ماشاءاللہ صاحب اولاد اور ہر طرح سے نیک نام ہیں۔

سید رونق کے دو بیٹے تھے ظفر حسین اور ریاض الحق، آخر الذکر لاولد تھے، بڑے بھائی کی

ایک بچی کو گود لئے ہوئے تھے۔ عرصہ ہوا دونوں بھائی اللہ کو پیارے ہو گئے ریاض اور ظفر حسین دونوں محکمہ پولیس سے وابستہ تھے۔ ان کی کئی بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں بڑے بیٹے سید مختیار احمد الہ آباد میں مقیم ہیں۔ ان کے دونوں بیٹے سید احمد اور منیر احمد سرکاری ملازم ہیں اور ہر طرح خوش وخرم ہیں۔

بڑے بھائی یعنی سید مختار احمد کی طرح ان کے چھوٹے بھائی وکیل احمد بھی پولیس میں ملازم تھے، میرے آنے کے بعد وہ بھی بیوی بچوں کے ساتھ پاکستان آگئے تھے۔ یہاں بھی پولیس سے وابستہ رہے۔ سب انسپکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے، آرام وسکون سے اپنی اولاد کے ساتھ رہتے ہیں۔ وکیل احمد کے چھ بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ بیٹوں کے نام اطیب احمد اور حسن وکیل ہیں دونوں برسر روزگار ہیں۔ وکیل احمد کی ایک بیٹی عقیلہ میرے بیٹے ابرار علی سے بیاہی ہیں۔ عقیلہ نے کراچی یونیورسٹی سے حیاتیات میں ایم اے کیا اور وہیں کچھ دنوں ملازمت بھی کی۔ پھر خانگی ضرورتوں کے تحت ملازمت چھوڑ دی، اب میرے گھر کا سارا کام انہیں کے سپرد ہے اور انہوں نے اپنے احسن اخلاق اور حسن عمل سے گھر کو بحمد اللہ جنت بنا رکھا ہے۔

پردادا سید حسن علی

میرے پردادا سید حسن علی کے تین لڑکے تھے۔ سید عمر علی سید اکبر علی اور سید اصغر علی، میں اپنے دادا سید عمر کا ذکر بعد میں کروں گا۔ میری دادی اور میرے دادا کے دونوں بھائیوں کی بیویاں ضلع فتح پور کے موضع فرشی سے تعلق رکھتی تھیں جو کہ بیکلپو رمبوئی سے ملا ہوا ہے، اکبر علی کے کئی لڑکیاں اور صرف ایک بیٹا تھا، بیٹے کا نام تھا یوسف علی عرف عام میں بھلن کہلاتے تھے۔ یوسف علی صاحب عرصہ ہوا مرحوم ہو چکے ہیں۔ ان کی بیگم حیات ہیں اور اپنے بیٹے کے ساتھ رہتی ہیں۔ سید اصغر علی کے تین بیٹے ہیں۔ سید وزیر علی اور سید امیر علی دونوں پولیس میں ملازم تھے۔ اللہ کو پیارے ہو گئے، سب سے چھوٹے بیٹے سید صغیر علی حیات ہیں اور بمبئی میں ہیں۔ تینوں بھائیوں کی

اولاد اب شہر میں رہتی ہے اور ہر طرح خوش ہے۔

دادا اور پردادا کی اولاد

میرے دادا عمر علی تینوں بھائیوں میں سے سب سے بڑے تھے لیکن اپنے والد یعنی میرے پردادا سید حسن علی کی زندگی ہی میں وفات پا گئے۔ اس لئے ان کی اولاد یعنی میرے والد اور چچا (محجوب) لمعاش کے مسئلے کا شکار رہے میرے دادا عمر علی کے چار بیٹے اور چار بیٹیاں یعنی آٹھ اولادیں تھیں، دو بیٹیاں قصبہ ارایاں میں اور دو بیٹیاں شاہ پور میں بیاہی تھیں۔ یعنی شاہ پور کے سید ممتاز احمد اور سید محمد احسن اور ارایاں کے سید محمد زبیر اور سید محمد امجد میرے حقیقی پھوپھا تھے۔ بعد کو ان سب سے قرابت در قرابت ہوتی چلی گئی اور رشتہ داروں میں سے بیشتر پاکستان آگئے ہیں اور کچھ ہندوستان میں ہیں۔

میرے دادا سید عمر علی کی اولاد نرینہ میں سید عاشق علی، سید صادق علی، سید باسط علی اور سید عابد علی تھے۔ سید صادق علی مستقلاً گاؤں میں رہتے تھے اور پورے خاندان کی زمینوں کے نگران تھے۔ ان کے دم قدم سے ہماری مختصر سی زمینداری کا بھرم قائم تھا۔ سید امجد علی اور سید محفوظ علی کے نام سے ان کے دو بیٹے ہیں اور تین بیٹیاں ہیں۔ سب پاکستان میں ہیں، صاحب اولاد ہیں اور خوش حال ہیں سید باسط علی کے دو بیٹے تھے سید ثابت علی عرف ابن حسن اور سید حافظ علی ابن حسن پولیس میں ملازم تھے پنشن لے کر بیت پور میں رہنے لگے تھے، کئی سال ہوئے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے ایک بیٹا اور تین لڑکیاں ہیں۔ سب ہندوستان میں ہیں۔ سید حافظ علی کے چار بیٹے اور دو لڑکیاں ہیں ہندوستان کے مختلف شہروں میں ملازمت کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ چچا باسط علی کی اولاد میں سے کوئی پاکستان نہیں آیا۔ سب کے سب ہندوستان میں ہیں۔

سید عابد علی کے چار بیٹے تھے سید زاہد علی (مرحوم) سید ذاکر علی سید شاکر علی اور سید شاہد علی، سید زاہد علی میرے ہم عمر تھے اور مڈل اسکول میں ساتھ تھے عین جوانی میں انتقال کیا ہے۔ سید

ذاکر علی کراچی پولیس میں سب انسپکٹر تھے کئی سال ہوئے سبکدوش ہو گئے اور ۱۰ سال سے زیادہ ہوئے پورے خاندان کے ساتھ گرین کارڈ پر امریکہ چلے گئے۔ سید شاکر علی پندرہ بیس سال سعودی عرب میں رہے، امیریکن فرموں میں کام کیا۔ یہ بھی اب امریکہ میں ہیں۔ ان کے بیٹے احمد علی اور حامد علی الترتیب ڈاکٹر اور انجینئر ہیں سید شاہد علی نے ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی سے ایم بی بی ایس کیا تھا۔ تقریباً ۲۸ سال سے امریکہ میں ہیں۔ نیورالوجی کے اسپیشلسٹ ہیں۔ اپنا مطب کرتے ہیں اور اپنے شعبہ علم کے ممتاز ماہرین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی بیگم طیبہ بھی ڈاکٹر ہیں یہ ڈاکٹر شاہد علی کی خاندان پروری اور بھائیوں سے بے پایاں محبت کا نتیجہ ہے کہ ان کے دونوں بڑے بھائیوں نے اپنی اولاد کے ساتھ امریکہ کا رخ کیا اس سارے عمل میں شاہد علی کی توجہ کو خاص دخل ہے۔ انہیں اپنے بھائی بہنوں سے غیر معمولی لگاؤ ہے اور وہ حسب ضرورت سب کی مدد کرتے ہیں سید عابد علی کے دو بیٹیاں بھی ہیں۔ چھوٹی کراچی میں اور بڑی ہندوستان میں۔ ذاکر علی میرے چچازاد بھائی ہونے کے ساتھ میرے بڑے اچھے دوست اور دست راست بھی ہیں۔ مجھے ان کی رفاقت اور محبت پر ہمیشہ ناز رہا ہے جب سے وہ امیریکہ چلے گئے ہیں میں بڑی تنہائی محسوس کرتا ہوں۔

میرے ابا جی

دادا جی کی اولاد میں میرے والد سید عاشق علی جنہیں ہم ابا جی کہتے تھے سارے بھائی بہنوں سے بڑے تھے چونکہ میرے دادا کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جبکہ ان کے بچے بہت کم عمر تھے اس لئے سارے خاندان کی تعلیم و تربیت، معاشی کفالت اور شادی بیاہ کی ذمہ داریاں میرے والد کے کاندھوں پر تھیں۔

میرے والد بہت اچھی اردو، فارسی اور ہندی جانتے تھے۔ ذوق سخن بھی رکھتے تھے اور فارسی نثر و نظم کے بہت سے ٹکڑے انہیں ازبر تھے۔ ملازمت کے دن محکمہ پولیس میں گزارے تھے،

سب انسپکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔ کمایا بھی خوب اور اڑایا بھی خوب۔ بے تحاشہ آمدنی، بے دریغ خرچ، حساب کتاب بہت جلد برابر ہو گیا۔ نتیجتاً ان کی اچانک وفات سے کئی برس تک جیسا کٹھن وقت میری والدہ اور ہم پر گزرا خدا کسی کو نہ دکھائے۔

والدہ محترمہ (بی بی)

میرے والد کی پہلی شادی شاہ پور میں حاجی سید سجاد حسین صاحب کی بہن سے ہوئی تھی، جلد ہی وفات پا گئیں، اولاد کوئی نہ تھی۔ دوسری شادی ایرایاں میں حافظ مقصود علی کی بیٹی عزیز النساء سے ہوئی۔ یہ میری والدہ تھیں اور انہیں ہم بی بی کہہ کر پکارتے تھے۔ ایسی نیک اور سیدھی، شریف کہ عزیز و اقارب ہی نہیں پورا محلہ اور گاؤں ان کی شرافت اور نیک طینی کی قسم کھاتا تھا۔ وہ پڑھی لکھی نہ تھیں لیکن والد صاحب کے انتقال کے بعد وہ ہمیں عالم غربت و افلاس سے جس خوبی اور حوصلہ مندی کے ساتھ نکال لے گئیں وہ ان کی ذہانت اور سوجھ بوجھ پر دلالت کرتا ہے۔

ان کے بیوہ ہو جانے کے بعد ہمارے گھر پے در پے جس طرح قیامتیں ٹوٹیں کوئی دوسرا ہوتا تو دم توڑ دیتا لیکن تنگ دستی و تنگ دامانی کے باوجود انہوں نے کبھی اپنی ناداری و بے بضاعتی کا ذرا احساس کسی دوسرے کو نہ ہونے دیا۔ گھر کا جو بھرم ابا جی کے زمانے میں قائم ہو گیا تھا اسے آخری سانس تک برقرار رکھا اور سارے عزیزوں کو حیرت زدہ بنائے رکھا۔ مجھے اپنی زندگی میں اگر کسی بات کا دکھ ہے تو صرف یہ کہ میری والدہ نے میری یتیمی اور محنت و مصیبت کا زمانہ تو دیکھا لیکن میری آسودگی و فارغ البالی کا زمانہ نہ دیکھ سکیں۔ میری شادی کے موقع پر وہ کتنی خوش تھیں، کچھ نہ پوچھیے، میں اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹا تھا اس لئے سب کا لاڈ پیار میرے حق میں ارزاں تھا، بی بی تو جب تک حیات رہیں مجھے تو چھوٹا بچہ ہی سمجھتی رہیں۔ میں بھی ان کی گود میں کبھی کبھی بچہ بن کر لیٹ جاتا تھا اور پھر بڑے مزے مزے کی باتیں ہوتی تھیں۔

۱۹۳۷ء میں میری شادی ہوئی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں مجھے اللہ نے ابرار علی کے نام سے پہلا

بیٹا دیا۔ اس وقت بی بی کی خوشیاں دیکھنے کے لائق تھیں۔ ابرار کے لئے انھوں نے اس کی پیدائش سے قبل ہی نہ جانے کتنی منتیں مان رکھی تھیں۔ سب پوری کی لیکن ہوا یہ کہ ابرار ابھی دو سال کا بھی نہ ہوا تھا کہ سخت بیمار ہو گیا حتی کہ مقامی ڈاکٹروں نے بھی جواب دے دیا اور ہماری مایوسی آخری حد کو پہنچ گئی۔ اس وقت بی بی کی پریشانی دیکھی نہ جاتی تھی۔ دوا سے زیادہ انہوں نے دعاؤں کا سہارا لیا ۔صبح شام تنہائی میں گھنٹوں اللہ کے حضور دامن پھیلائے بیٹھی رہتیں آخرکار ان کی دعا قبول ہوئی۔ ابرار جلد پوری طرح صحت مند ہو گیا۔ اب سوچتا ہوں کہ اگر آج بی بی ہوتیں تو ابرار کو دیکھ کر کتنی خوش ہوتیں۔ میری یہ حسرت میری زندگی کا بہت بڑا دکھ ہے اور میں اس دکھ سے شاید کبھی نجات نہ پا سکوں گا۔ تنہائی میں بیٹھ کر رو لیتا ہوں کچھ دیر کے لئے جی ہلکا ہو جاتا ہے اور فراق گورکھپوری کا یہ شعر:

رو کر عشق خوش ہوا ہے
وقت سہانا اب آیا ہے

میرا ترجمان بن جاتا ہے۔ لیکن نہ جانے کیا ہے کہ تھوڑے دن بعد اکثر بی بی کی یاد مجھے بری طرح ستاتی رہی ہے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے اور کروٹ کروٹ چین نصیب کرے اب تو ان کی یاد ہی میرے زندگی کا بڑا اثاثہ اور سہارا ہے۔

بی بی (والدہ مرحومہ) پر ایک نہیں مصیبت کے کئی پہاڑ پے در پے ٹوٹے۔ میرے والد کا انتقال ۱۹۳۳ء میں ہوا تھا مشکل سے باسٹھ تریسٹھ سال کی عمر پائی ہوگی۔ میری عمر اس وقت چھ سات سال تھی۔ بی بی اس کے بعد پندرہ سولہ سال حیات رہیں۔ ابا جی کے غم کو وہ جھیل جاتیں کہ حد درجہ صابر و شاکر خاتون تھیں۔ لیکن ابا جی کی وفاتؒ سے کچھ ہی پہلے میرے جواں سال بھائی اشفاق علی کا ہیضہ کی وبا کے بہانے اچانک انتقال ہو چکا تھا۔ بی بی اس حادثہ کے بعد بہت نڈھال رہنے لگی تھیں۔ ابا جی کی وفات کو مشکل سے تین چار سال گزرے تھے کہ میرے بڑے بہنوئی سید عبدالباری بھی دق کے موذی مرض کا شکار ہو کر کوئی چالیس سال کی عمر میں رخصت ہوئے اور

میری سب بڑی بہن جنہیں میں آپا کہتا تھا تقریباً جوانی میں بیوہ ہو گئیں۔ بی بی پر جوان بیٹی کی بیوگی نہایت شاق گزری، ان کے بچوں کی کفالت بھی ان کے سر آن پڑی لیکن وہ اس بار کو نبھا لے گئیں۔ اور جب تک حیات رہیں ہمیں افسردہ اور ہماری آنکھوں میں آنسو دیکھنا پسند نہ کیا۔

بہنیں اور بھائی

میری دو بہنیں تھیں سیدہ خاتون سب میں بڑی تھیں، ناوقت بیوگی کے بعد وہ ہمارے ہی ساتھ رہیں اور بی بی کی وفات کے بعد انہوں نے ہمارے لئے ماں کی جگہ لے لی پاکستان آگئی تھیں یہیں وفات پائی، ملیر سٹی میں مدفون ہیں ان کی بڑی بیٹی کی شادی سنجی پور (الہ آباد) میں سید محمد قائم سے ہوئی تھی۔ پہلی زچگی کے موقع پر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ان کی دوسری بیٹی زبیدہ سلمہا بھی نومبر ۱۹۹۱ء میں ناگاہ بیوہ ہو گئی، ان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں اور مستقلاً بمبئی میں ہیں۔

بہنیں

بڑی بہن کے ایک ہی بیٹے سید عبدالعلی وارثی عرف دلارے میاں تھے تقریباً تین سال ہوئے اچانک ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے، بچپن سے جوانی تک میرے ساتھ رہے۔ شادی کے بعد اپنے بال بچوں کے ساتھ الگ رہنے لگے تھے۔ حد درجہ خوش مزاج و خوش اخلاق تھے، مجھ سے اور میرے بچوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ میں بھی انہیں اپنے بچوں سے کم نہیں چاہتا تھا، وہ بچپن سے ہمارے ساتھ رہے ہیں، پلے بڑھے ہیں اور جوان ہوئے ہیں جب تک رہے، بحمد اللہ ہر طرح خوش رہے، بابا محبت شاہ کے مرید و سجادہ نشین تھے، پرہیزگار و دیندار تھے، ہر طرح کی برائی سے پاک صاف ستھری زندگی، خدا ترسی کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ کے ای ایس سی میں ملازم تھے ان کی اولاد ہونہار اور تعلیم یافتہ ہے بیوی بہت سمجھدار اور سگھڑ ہے بچوں کی تعلیم و تربیت میں وارثی سے زیادہ انہیں کا حصہ ہے۔

میری چھوٹی بہن طیبہ خاتون تقسیم ہند کے بعد بھی ہندوستان ہی میں آبائی گاؤں

''بیت پور'' میں مقیم رہیں۔ چند سال ہوئے انتقال کیا، بڑی نیک اور محبت کرنے والی بہن تھیں۔ ان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ سب ہندوستان میں ہیں اور خوش و خرم ہیں

میرے ایک ہی بڑے بھائی تھے اور باپ کی جگہ داخل تھے کہ میری تعلیم و تربیت کی ساری ذمہ داری انہیں کے سر رہی۔ ۱۹۹۶ء میں انتقال کیا، پورا نام سید شمشاد علی ہے تمنا تخلص کرتے تھے۔ شعر و شاعری کا طبعی ذوق رکھتے تھے۔ مطالعہ وسیع تھا، البتہ میری طرح وہ رسمی تعلیم حاصل نہ کر سکے، میری خاطر انہوں نے اپنی تعلیم کو قربان کر دیا۔

بڑے بھائی کے تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ سب اپنے اپنے بال بچوں کے ساتھ خوش ہیں۔ بیٹے کا نام سید آباد علی ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ اسٹیٹ بنک آف پاکستان میں ڈائریکٹر ہیں، ماشاء اللہ بہت ذہین اور محنتی ہیں۔ میٹرک کے بعد کی ساری تعلیم انہوں نے اپنے طور پر میری طرح پرائیویٹ حاصل کی۔ بنک میں بھی اپنی قابلیت اور محنت کے طفیل بہت جلد ترقی حاصل کر لی۔ تینوں بہنوں کی شادی نہایت قرینے سے کی اور والدین کے آرام و آسائش کا بھی ہر طرح خیال رکھا۔ ان کی اس سعادت مندی کے نتیجے میں اللہ نے انہیں ہر طرح خوش و خرم رکھا ہے۔ صاحب اولاد ہیں اور اولاد بھی بہت ہونہار ہے۔

میری شادی

والدہ مرحومہ (بی بی) کو میری شادی کا بڑا ارمان تھا، مڈل پاس کرنے کے بعد ہی وہ میری شادی کر دینا چاہتی تھیں لیکن حالات اس کی اجازت نہ دیتے تھے۔ میٹرک کرنے کے فوراً بعد جیسے ہی مجھے مسلم ہائی سکول فتح پور میں ماسٹری مل گئی انہوں نے میرے لئے رشتے تلاش کرنے شروع کر دیئے۔ میں پرائمری اسکول، مڈل اسکول اور ہائی اسکول کے امتحانوں میں اوّل آیا تھا، اس لیے قریب و دور کے سارے عزیزوں میں ہونہاری کے چرچے تھے۔ گھر کے حالات بھی بہتر ہو گئے تھے، ایسے میں رشتے میں کوئی دشواری نہ تھی، جو لوگ میرے باشعور و بالغ ہو جانے

سے پہلے تک ہمارے گھر کی گرتی ہوئی دیوار کے قریب آنے کے روادار نہ تھے وہ بھی کسی نہ کسی بہانے ہماری طرف رخ کرنے لگے تھے۔ بعض نے تو اپنی دولت و ثروت اور رسوخ و اثرات کے سبب اپنے طور پر یہاں تک طے کر لیا تھا کہ اگر ان کی طرف سے رشتے کا ہلکا سا اشارہ بھی ہو جائے گا تو بات خالی نہ جائے گی۔ بی بی اور میری بڑی بہنیں بھی اس زمانے کے عام رواج اور تقاضائے عصری کے تحت یہی چاہتی تھیں کہ کسی اونچے گھرانے میں رشتہ ہو جائے پہلے تو میں نے ایسی باتوں پر توجہ نہ دی لیکن جب سنجیدگی سے گھر میں اس مسئلے پر باتیں ہونے لگیں تو مجھ سے نہ رہا گیا بھی سے بالمشافہ بات کرنے کی ہمت تو نہ ہوئی کہ اس وقت ہمارے خاندان میں ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا جاتا تھا، پھر بھی میں نے ایک طویل خط بڑے بھائی کو اس طور پر لکھا:

''میرے رشتے کی باتیں ادھر ادھر کیوں کی جا رہی ہیں۔ میری شادی اگر خالہ زاد بہن سلمٰی سے ہو جائے تو کیا خرابی ہے؟ میں تو لڑکپن سے یہ سنتا چلا آ رہا ہوں اور آپ ہی لوگوں کی زبانی سنتا چلا آ رہا ہوں کہ سلمٰی اپنے والدین کے گھر کی بجائے اتفاقاً اپنے خالو یعنی ہمارے گھر میں پیدا ہوئی تھی اور آپ لوگوں نے اسی وقت یہ اعلان کر دیا تھا کہ سلمٰی ہمیشہ اسی گھر میں رہیں گی۔ گویا آپ لوگوں نے میرے لئے انہیں مانگ رکھا تھا۔ پھر اس دعویٰ سے انحراف کیا جا رہا ہے۔ مانا کہ وہ میری طرح یتیم ہیں اور گاگا (خالہ جان) کے گھریلو حالات ہم سے بھی زیادہ خراب ہیں لیکن کیا یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس رشتے کو آپ لوگوں نے کسی وجہ سے بھی جوش محبت میں قائم کیا تھا اسے صرف تعلیم اور معاشی فرق کی بنا پر توڑ دیا جائے۔ خالہ جان کو ان کی بیکسی کے سبب نظر انداز کیا جائے اور شادی کا سلسلہ کسی ایسے گھر سے قائم کر لیا جائے جو ہمارے لیے سہارا بن سکے۔ مجھے اس قسم کے سہاروں سے نفرت ہے۔ میں مشیت

الٰہی اور اپنے زورِ بازو کے سوا کسی کے سہارے کا قائل نہیں، مشکلیں اور آسانیاں اللہ کی طرف سے ہیں۔ ہم حالات کا مقابلہ کرتے چلے آئے ہیں آئندہ بھی ہمیں یہی کرنا چاہیے"۔

شادی کے بارے میں میرے خیالات سن کر میرے بھائی بکّن حیرت میں پڑ گئے اور انہوں نے میرے خط کے فوراً بعد خالہ جان کو میرے رشتے کا پیغام بھجوا دیا۔ سارے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس طرح دو خاندان، جو اپنے اپنے مشکل حالات میں پھنسے ہوئے تھے اور ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے تھے، ایک بار پھر قریب آ گئے اور چند ہی روز میں بحمد اللہ دونوں کے حالات ایسے بدلے اور ایسے خوشگوار ہو گئے کہ سجدہ شکر بجالانا پڑتا ہے۔

میرے بڑے بھائی نے میری خوشی و دلجوئی کے خاطر میری شادی اپنے حالات سے بڑھ کر بڑی دھوم دھام سے کی۔ اس وقت وہ بھی شعر کہتے تھے۔ میں بھی کہتا تھا چنانچہ طے پایا کہ عام دعوت ناموں کے برعکس شادی کے لئے منظوم دعوت نامہ تیار کیا جائے عبارت بنائی گئی دن اور تاریخ طے پائیں، گزارش والتماس کے لئے فقرے اور ابتدا و اختتام، آداب و کلمات مرتب کئے اور بڑے بھائی نے ایک خوبصورت سا دعوت نامہ منظوم کر دیا یہ ایک کارڈ پر چھاپا گیا اور تقسیم ہوا۔ اتفاق سے یہ دعوت نامہ بعض عزیزوں کے پاس ہنوز محفوظ ہے۔

شادی میں شریک

شادی میں عزیزوں اور دوستوں کے علاوہ، فتح پور کے متعدد ممتاز شہریوں، مسلم ہائی اسکول کے ساتھی، اساتذہ، اسکول کے ہیڈ ماسٹر محمد اسحاق صدیقی صاحب اور مسلم ہائی سکول فتح پور کے منیجر اور شہر کے ممتاز وکیل جناب سید اولاد حسین صاحب نے اپنی پوری فیملی کے ساتھ شرکت کی تھی۔ میرا شمار استاد محمد اسحاق کے عزیز ترین شاگردوں میں تھا اور ہائی اسکول کے شاگردوں میں تھا اور ہائی سکول کرنے کے بعد انہیں کے لطفِ خاص سے انہیں کے ساتھ اسکول میں پڑھانے لگا

تھا۔ سید اولاد حسین ایڈووکیٹ کے صاحبزادے احمد حسین عرف ابو میاں کے اتالیق ہونے کی حیثیت میں کئی سال ان کے ساتھ رہ چکا تھا اس لئے محمد اسحاق صدیقی اور سید اولاد حسین دونوں مجھے اپنی اولاد کی طرح چاہتے اور اپنے گھر کا فرد سمجھتے تھے چنانچہ پورے خاندان کے ساتھ شادی میں شریک ہوئے اور سہرہ بندی اور نکاح کے موقعوں پر میرے حق میں باپ جیسا کردار ادا کیا۔ دونوں اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں لیکن ان کی یادیں اور محبتیں میرے دل پر نقش ہیں اور بحمد اللہ ان کے گھروں اور ان کی اولاد سے آج بھی اسی طرح کے مخلصانہ روابط قائم ہیں۔

دعوت نامے میں وضاحت ہے کہ بارات ہیبت پور سے ارایاں جائے گی۔ ارایاں میرا ننھیال ہے اور سلمٰی کے والدین نے نانا جی کے گھر کو اپنا گھر کر لیا تھا۔ ہیبت پور اور ارایاں کا فاصلہ پورے چھ میل ہے۔ تقریباً ۹ بجے شام کو بارات روانہ ہوگئی۔ کچھ لوگ پیدل چل پڑے، کچھ نے سائیکلوں پر سفر کیا، بیشتر یکّے اور بیل گاڑیوں پر روانہ ہوئے، مجھے گھوڑے پر بٹھایا گیا۔ بینڈ باجے والوں اور قوالوں کے لئے بھی نکاح بڑھایا گیا سواریوں کا انتظام کیا۔ ڈیڑھ بجے رات بارات ارایاں پہنچی پہلے شربت سے تواضع کی گئی پھر طعام کی نوبت آئی پھر قوالی۔

نذیر قوال:

فتح پور کے مشہور قوال نذیر اور ہم نوا نے رنگ جمایا، زیادہ تر فارسی کی اور ایک دو اردو کی عاشقانہ غزلیں سنائیں۔ اتنے میں فجر کی اذان ہوگئی اور تھوڑی دیر میں باراتیوں کے لئے ناشتہ آ گیا۔ ناشتہ کے بعد کتھا ڈلی، سونف، الائچی، پان، اور خوشبو وغیرہ سے ایک بار پھر باراتیوں کی تواضع کی گئی۔ بارات میں شریک غیر مسلموں کے کھانے کا الگ بندوبست ہوا۔ کہاروں اور گاڑی بانوں کو سیدھا دیا گیا جانوروں کے لئے کھلی، دانہ اور اچھے قسم کا بھوسا فراہم کیا گیا۔ اس کے بعد بین باجے والوں نے اور قوالوں نے ایک بار پھر اپنا رنگ جمایا بینڈ باجے والوں نے بچوں کو اور قوالوں نے بڑوں کو حسب توفیق محظوظ کیا۔ اس عرصے میں شادی کی وہ رسمیں بھی ادا ہوئی رہیں جن

کا تعلق نوشے کو دلہن کے گھر لے جا کر شربت پلانے، پان کھلانے اور آرسی مصحف وغیرہ کی عجیب وغریب وارداتوں سے ہے۔

ہلدی لگانے کی رسم اور ہنگامہ:

ظہر کی نماز کے بعد دوپہر کے کھانے کا اہتمام ہوا۔ مسلم ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر محمد اسحاق صدیقی صاحب کو نوشے کے برابر خاص اہتمام سے جگہ دی گئی کہ یہی ہر اعتبار سے بزرگ تھے اور مجھ سے تعلق خاطر کے سبب میرے والد مرحوم کی جگہ داخل تھے یعنی سمدھی کا کردار ادا کر رہے تھے۔ ہمارے علاقے میں کھانے کے درمیان سمدھی کی داڑھی میں لڑکی والوں کی طرف سے ہلدی لگانے کی ایک رسم ہے۔ یہ عمل لڑکی والے سمدھی کو غافل پا کر ہمت وہوشیاری سے کرتے ہیں لیکن لڑکے والے بھی چوکنا رہتے ہیں۔ محمد اسحاق صاحب صوم وصلوٰۃ کے پابند، شریف النفس بزرگ تھے اور داڑھی بھی رکھتے تھے۔ لڑکی والوں نے انہیں کی داڑھی کو ہلدی سے رنگنے کا پروگرام بنا رکھا تھا، ادھر صورت یہ تھی کہ اسحاق صاحب کے درجنوں نوجوان شاگرد بارات میں شریک تھے اور انہوں نے لڑکی والوں سے پہلے کہہ دیا تھا کہ ہلدی لگانے کی رسم کو موقوف کر دیا جائے اور اگر ایسا کرنا ضروری ہو تو اسحاق صاحب کی داڑھی کو ہرگز ہاتھ نہ لگایا جائے۔ لیکن ایسے موقعوں پر کون کس کی سنتا ہے بات آخر وہی ہوئی کہ جس کا ڈر تھا۔

قصبے کے رئیس جناب سید مظہر الحسن فتح الٰہی عرف رغب میاں، (مرحوم) طبعاً بہت شوخ مزاج بزرگ تھے، رشتے میں دلہن اور دولہا دونوں کے خالہ زاد بھائی تھے لیکن شادی میں لڑکی کی طرف سے بطور خاص شریک ہوئے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنے بعض نوجوانوں کو اسحاق صاحب کی داڑھی میں ہلدی لگانے کی شہ دی، چنانچہ کھانے کے ایک ہی دو لقمے توڑے گئے ہوں گے ایک صاحب نے پیچھے سے آ کر اسحاق صاحب کی داڑھی میں ہلدی لگا دی۔ لیکن موقعے ہی پر پکڑ لئے گئے، اور ان کی تخت پناہی ہوئی۔ اس پر لڑکی والے مشتعل ہو گئے اور باراتیوں کے ساتھ

ان کے باقاعدہ ٹھن گئی، پہلے ہاتھا پائی پھر کھانے کی پلیٹیں چلیں بعد ازاں پتھر اور ڈنڈے کی نوبت آن پہنچی۔ کچھ لوگوں نے بروقت مداخلت کر کے حالات پر قابو پالیا۔ اس پکڑ دھکڑ اور مار کوٹ میں کئی نوجوانوں کو چوٹیں آئیں۔ ایک پتھر میرے عزیز ترین دوست شباہت علی خان کی پیشانی پر لگا گورے چٹے کشادہ پیشانی کے نوجوان تھے، بہت خون نکلا اور ان کے ماتھے کا زخم انہیں میری شادی کا ایک مستقل نشان دے گیا۔

شباہت علی خان میرے ان دوستوں میں ہیں جن کے ساتھ میں ۱۹۳۸ء میں بسلسلہ ملازمت خلیج فارس گیا، میں واپس آ گیا وہ ادھر کے ہو رہے۔ فرینکفرٹ کے باسی ہیں، مستقلاً وہیں رہتے ہیں۔ میں تین سال پہلے ان سے ملنے فرینکفرٹ گیا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ میری زندگی کا سارا ریکارڈ ان کے پاس محفوظ ہے حتیٰ کہ میری شادی کے سلسلے کی وہ تصویریں بھی ان کے پاس نکل آئیں جو ۱۹۴۲ء میں انھوں نے اتاری تھیں۔ ان میں ایک تصویر وہ بھی ہے جس میں وہ اپنی پیشانی پر رومال باندھے ہوئے کھڑے ہیں۔ یہ اسی جھگڑے کا نشان ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ رومال کی پٹی کی مدد سے انھیں تصویر میں آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔

میری اولاد (بڑے بیٹے سید ابرار علی):

میرے دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ بڑے بیٹے سید ابرار علی نے پرائمری، جونیئر ہائی اسکول، میٹرک اور انٹر کے سارے امتحانات فرسٹ ڈویژن میں پاس کئے اور میرٹ اسکالرشپ لیے۔ بعد ازاں درجہ اول میں این ای ڈی کالج کراچی سے الیکٹریکل میں بی ای کیا، پھر امریکا سے بھی بعض امتحانات پاس کئے۔ کے ای ایس میں ملازم ہوئے اور اللہ کا احسان ہے کہ ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ چیف انجینئر ہونے کے ساتھ ساتھ اس وقت انتظامیہ کے چیف ہیں۔ اپنے ماتحتوں، ہم رتبہ انجینئروں اور سینئر آفسروں میں مقبول اور پبلک میں نیک نام ہیں۔ اپنے شعبے کے ماہرین میں شمار کیے جاتے ہیں، لکھنے پڑھنے سے خصوصی دلچسپی ہے۔ الیکٹرک ٹی اور

الیکٹرانک کے موضوع پر مذاکرات میں عموماً شرکت کرتے ہیں۔ ملک سے باہر یورپ، امریکہ، انگلستان، چین اور جاپان وغیرہ کی متعدد کانفرنسوں میں شرکت کر چکے ہیں، مقالے پڑھے ہیں۔ نیک نامی و شہرت حاصل کی ہے اور پاکستان کا نام اونچا کیا ہے۔ ان دنوں سرسید یونیورسٹی میں الیکٹرونک کے استاد ہیں۔

گھریلو ذمہ داریوں سے بھی وہ غافل نہیں رہتے، سارے بھائی بہنوں کی پرسش احوال کے ساتھ ہر طرح مدد کرتے ہیں خود بھی خوش رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے ہیں۔ ان کی کامیاب زندگی میں ان کی بیوی عقیلہ سلمہا کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ عقیلہ کا ذکر اس سے پہلے بھی کسی جگہ آچکا ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ یعنی ایم ایس سی ہیں نیک اطوار اور خوش اخلاق ہیں اور گھر ہی میں نہیں پورے خاندان میں اپنی خندہ پیشانی کے سبب ہر دل عزیز ہیں۔ ان کے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے بیٹے کا نام رافع بن علی اور بیٹی کا نام سرا علی ہے، دونوں بحمد اللہ ذہین و ہونہار ہیں۔ میرے شب و روز اب انہیں کے ساتھ ہنستے کھیلتے بڑے مزے سے گزر رہے ہیں۔ خدا ان کی عمر دراز کرے اور ہمیشہ خوش رکھے۔

چھوٹے بیٹے سید ابصار علی

میرے چھوٹے بیٹے سید ابصار علی نے بڑے بھائی کی طرح ہر امتحان درجہ اول میں پاس کیا اور میٹرک میں ٹاپ کیا۔ باعتبار پیشہ ڈاکٹر ہیں۔ ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی سے ایم بی بی ایس کیا تھا، ہاؤس جاب کر کے کچھ دنوں جناح ہسپتال میں ملازمت کی۔ پھر دو سال ایران میں رہے، وہیں سے امریکن امتحان پاس کیے اور نیویارک چلے گئے۔ انٹرنل میڈیسن میں تین سال کی ریذیڈنسی مکمل کر کے ایم ڈی کیا اور ساتھ ہی بورڈ کا امتحان بھی پاس کیا۔ ابھی حال ہی میں نفرالوجی میں فیلوشپ مکمل کی ہے گویا اسپشلسٹ ہو گئے ہیں۔ شادی کو ابھی تین سال ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم سنبل بنت رئیس سلمہ جو اب بیگم سنبل ابصار کہلاتی ہیں، ماشاء اللہ بہت سلیقہ شعار، شگفتہ مزاج اور خوش اخلاق ہیں۔ پہلے انٹر سائنس کیا پھر انگریزی لٹریچر کے ساتھ بی۔ اے کیا، ماہیسوری کی

باقاعدہ تربیت حاصل کرنے کے بعد کچھ دنوں ماہیسوری اسکول میں پڑھاتی بھی رہیں، شادی کے بعد، سلسلہ تعلیم منقطع ہو گیا۔ اسے از سر نو جاری کرنے کی کوشش میں لگی ہیں اور مجھے ان کی سیرت و محبت اور ذوق و شوق سے یقین ہے کہ وہ گھر کو خوش اسلوبی سے چلانے کے ساتھ ساتھ، مزید تعلیمی و تربیتی مدارج بھی طے کر لیں گی۔ ابھی حال میں وہ بھی اپنے شوہر، ابصار کے پاس امریکہ پہنچ گئی ہیں۔ دونوں نیویارک کے مشہور علاقہ مین ھٹن میں نیویارک یونیورسٹی اسپتال کے بالمقابل ۳۲ اسٹریٹ پر ایک خوبصورت فلیٹ میں رہتے ہیں اور اکثر فون پر بات کر کے میرا دل خوش کرتے ہیں۔ ہمارے گھر میں ابصار کا قہقہہ بہت مشہور ہے۔ خود کوئی بات کہتے ہیں اور اس پر ایسا زوردار قہقہہ لگاتے ہیں کہ ان کا قہقہہ سب کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیتا ہے، بہت دلچسپ اور سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں لیکن دنیاداری انہیں بالکل نہیں آئی۔ موقع بے موقع دو ٹوک بات کہہ جاتے ہیں۔

بیٹیاں

بڑی بیٹی شمیم سلمان

اب مختصر سا ذکر بیٹیوں کا ہو جائے۔ بڑی بیٹی شمیم سلمہا کی غیر معمولی ذہانت، محنت، سوجھ بوجھ، خوش طبعی و خوش اخلاقی، بھائی بہنوں کی دلجوئی و دلنوازی، عزیزوں کی پذیرائی اور ذوق شوق کی ہمہ گیری کا ذکر سمجھ میں نہیں آتا کس طرح کروں؟ لوگوں کو یقین نہیں آئے گا اس لئے اس ذکر کو ختم کرتا ہوں۔ پیشے کے لحاظ سے شمیم ڈاکٹر ہیں۔ ان کے شوہر سلمان ظفر بھی ان کے ہم پیشہ ہیں اور دونوں جناح ہسپتال اور کارڈیو واسکولر میں ملازم رہے۔ پھر دونوں الجیریا چلے گئے وہاں تقریباً تین سال رہے، وہیں سے امریکن امتحانات پاس کر کے نیویارک چلے گئے۔ ایم۔ ڈی اور بورڈ کرنے کے بعد ملازمتوں میں لگ گئے۔ سلمان سلمہ نے الٹرا ساؤنڈ میں بھی خصوصی تربیت حاصل کر کے ایسی ماہرانہ حیثیت حاصل کر لی کہ اب وہ نیویارک میں اپنا ذاتی کلینک نہایت کامیابی سے چلا رہے ہیں۔ شمیم نے ہماٹالوجی (Himatalogy) اور ان کالوجی

(Onchology) میں فیلوشپ کیا ہے، اسپیشلسٹ کی حیثیت میں وہ ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنی پریکٹس بھی کرتی ہیں۔ میاں بیوی دونوں اپنے اپنے کاموں میں مست اور خوش وخرم ہیں۔ نیویارک کے صاف ستھرے علاقے اسٹیفن آئی لینڈ میں انہوں نے ایک بہت خوبصورت مکان بنایا ہے اور ہر طرح مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے دو بچیاں اور ایک بیٹا ہے، بچیوں کے نام اروج اور صفوہ ہیں۔ بیٹے کا نام واجب سلمان ظفر ہے۔ تینوں پرائمری اور سیکنڈری اسکول میں زیر تعلیم ہیں اور پڑھنے لکھنے میں والدین کی طرح ذہین ومحنتی ہیں۔

وسیم فرمان

میری ایک اور بیٹی بھی ڈاکٹر ہے ان کا نام وسیم فرمان ہے۔ شادی کے بعد وسیم فرمان کے بجائے وسیم صلاح الدین لکھتی ہیں۔ صلاح الدین حبیب بنک میں ایک معزز عہدے پر فائز ہیں۔ بہت خوش اخلاق، خوش مزاج، محنتی، ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ بنک کے کام میں طاق ہیں۔ معلومات عامہ بھی بہت اچھی ہے، شعروادب سے دلچسپی رکھتے ہیں، النور سوسائٹی میں نیا مکان خریدا ہے اور وہیں اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ وسیم فرمان سرکاری ملازم ہیں۔ صوبائی محکمہ صحت سے منسلک ایک اسپتال میں کام کرتی ہیں۔ گھر پر صرف کلینک کے نام سے ذاتی ڈسپنسری ہے جس میں شام کو مطب کرتی ہیں۔ وسیم صلاح الدین کی دو ننھی منی سی خوبصورت بیٹیاں ہیں۔ ایک کا نام صدف اور دوسری کا فرح ہے، دونوں مجھ سے بہت مانوس ہیں اور جب ہمارے گھر آتی ہیں تو سب سے پہلے میرے ہی کمرہ میں داخل ہوتی ہیں۔

نجمہ فرمان

دوسری بیٹی نجمہ فرمان سلمیٰ، شمیم سلمان سے چھوٹی اور ابصار و وسیم سے بڑی ہیں۔ نجمہ کی شادی میرے چچازاد بہن کے بیٹے عزیزی شمس الحق ہاشمی سے ہوئی ہے۔ بہت نیک دل اور محنتی

ہیں، کہنے کو صرف پوسٹ گریجویٹ یعنی ایم اے ہیں لیکن انجینئرنگ کے کاموں میں خاصی دلچسپی ہے۔ الیکٹرانک سے متعلق شاید ہی کوئی کام ہوگا جو وہ کامیابی سے نہ کر لیتے ہوں۔ گھر کی چھوٹی موٹی اشیاء کی مرمت انہیں کے سپرد رہتی ہے۔ بہت خوش اخلاق اور ملنسار ہیں، حسب مراتب سب کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ کے ای ایس سی میں ملازم ہیں اور پوری ذمہ داری سے اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ نجمہ نے پہلے انٹر سائنس کیا، پھر لائبریری سائنس اور سوشل ورک میں ایم اے کیا، دونوں میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ سات سال سے کراچی یونیورسٹی کے شعبہ سماجی بہبود میں پڑھا رہی ہیں اور اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ رفاہ عامہ سوسائٹی میں ان کا اپنا ذاتی گھر ہے۔ صاحب اولاد ہیں ایک بیٹا ہے، ایک بیٹی ہے بیٹے کا نام سمیع الحق ہے اسکول جاتا ہے۔ بیٹی ثمن کہلاتی ہے ابھی بہت چھوٹی ہے۔

عظمیٰ فرمان

میری سب سے چھوٹی بیٹی کا نام عظمیٰ ہے۔ سب سے چھوٹی ہونے کی حیثیت میں ظاہر ہے کہ مجھے سب سے زیادہ پیاری ہے بلکہ سارا گھر، اسے بہت چاہتا ہے۔ بھائی بہن حتیٰ کہ اس کے بھتیجے بھانجے بھی اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ بھی ان کو دل وجان سے چاہتی ہے۔ عظمیٰ نے سیکنڈ ڈویژن میں بی ایس سی کیا تھا، ریاضی اور فزکس کے ساتھ لیکن نہ جانے کیوں وہ سائنس سے بددل ہوگئیں اور اردو ایم اے میں داخلہ لے لیا ہے۔ پہلے سال کے امتحان میں بہت اچھے نمبر حاصل کیے ہیں اور اردو زبان وادب سے اپنی دلچسپی کا ثبوت فراہم کیا ہے اب آخری سال میں ہیں اور ان کا مستقبل ان کے نتیجے سے وابستہ ہے۔ ان کی ذہانت اور محنت سے توقع ہے کہ وہ اپنے دوسرے بھائی بہنوں کی طرح زندگی میں کامیاب رہیں گی۔

میری بیوی سلمیٰ

اب آخر میں، تھوڑا سا ذکر گھر کی مالکہ سلمیٰ کا ہو جائے۔ سلمیٰ کی پیدائش جیسا کہ پچھلی سطروں میں کہیں بتا چکا ہوں میرے گھر یعنی بیت پور میں ہوئی لیکن ان کی پرورش و تربیت میرے گاؤں بیت پور سے چھ میل دور قصبہ ایرایاں میں نانا کے گھر ہوئی۔ میں نے مڈل کا امتحان ایرایاں ہی سے پاس کیا تھا۔ اس وقت سلمیٰ وہاں کے لڑکیوں کے مدرسے میں پڑھ رہی تھیں۔ قرآن پاک کا ناظرہ اور مناجات و میلاد کی کتابیں گھر میں ختم کر چکی تھیں۔ رسمی تعلیم کے لئے قصبے کے سکول میں داخلہ لیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں شادی کے بعد ان کی تعلیم کا جو سلسلہ ٹوٹ گیا تھا وہ پاکستان آ کر پھر کسی نہ کسی طرح جڑ گیا۔

سلمیٰ کی والدہ یعنی میری خالہ لطیف النساء بھی پاکستان آ گئیں تھیں اور میری والدہ کی جگہ واقعی تھیں۔ زیادہ تر میرے ہی ساتھ رہیں اور میرے ہی گھر میں سلمیٰ کے ہاتھوں پر، پانچ سال ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ بہت پڑھی لکھی اور صابر و شاکر خاتون تھیں۔ فارسی کی شدبد بھی رکھتیں تھیں۔ اردو لکھنے پڑھنے پر تو پوری مہارت تھی۔ چنانچہ ان کا زیادہ وقت، بچوں کو پڑھانے میں یا اخبار بینی و مطالعہ کتب میں گزرتا تھا۔

کچھ ننھیال کے بارے میں

میرے نانا حافظ مقصود علی، اردو فارسی پر غیر معمولی مہارت رکھتے تھے، عربی بھی جانتے تھے اور حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے خطاط بھی تھے۔ ان کے زمانے میں نہ تو فتح پور میں پریس تھا اور نہ مطبوعہ کتابوں کا زیادہ رواج۔ عام طور پر ہاتھ سے کتابیں لکھیں اور نقل کی جاتی تھیں، نانا کو چونکہ علم و ادب سے خصوصاً فارسی شاعری سے خاص لگاؤ تھا اس لئے سارے ممتاز فارسی شعراء مثلاً فردوسی، سعدی، حافظ، عرفی قانی، امیر خسرو، فیضی، بیدل وغیرہ کے دواوین کے

علاوہ قصہ چہار درویش، انوار سہیلی، نثر ظہوری، اخلاق ناصری، گلستان و بوستان انشائے ابوالفضل وغیرہ کے خطی نسخے انھوں نے اپنے ہاتھ سے تیار کیے تھے۔ نانا کا گھر کیا تھا قلمی نسخوں کا کتب خانہ تھا۔

مڈل اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں میں نے یہ کتب خانہ ایک بار نہیں بار بار دیکھا اور بچپن میں اس کی مجلدات سے کھیلا۔ بعض نسخوں پر طلائی حاشیے اور طلائی جلدیں تھیں بعض کا کاغذ بوسیدہ ہو رہا تھا اور بعض کے ورق ٹوٹ ٹوٹ کر گرے جا رہے تھے یہ ساری خطی کتابیں کپڑوں کی پوٹلی میں بندھی ہوئی، دالان کی دیواروں کی کھونٹیوں میں ٹنگی ہوئی تھیں یا لکڑی کے صندوق میں بھی بھری ہوئی تھیں۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو اس وقت ان کتابوں سے کوئی دلچسپی لینے والا نہ تھا۔

شادی بیاہ یا دوسری تقریبات کے موقع پر جب پان اور کھانڈ لی یا شیرینی کی تقسیم کی ضرورت پڑتی تو کوئی خطی نسخہ نکال لیا جاتا اور اس کے اوراق پڑیا بنانے کے کام آ جاتے بہت سے مخطوطے میرے دیکھتے دیکھتے اسی قسم کے کاموں میں صرف ہو گئے۔ کچھ کیڑے مکوڑوں اور دیمک کی نذر ہو گئے۔ پھر بھی جب میں پاکستان کے لئے روانہ ہوا تو متعدد قیمتی نسخے خستہ حالت میں گھر میں موجود تھے لیکن جب میں ۱۹۶۱ء میں پہلی بار ہندوستان گیا تھا تو یہ ساری چیزیں پوری طرح تباہ ہو چکی تھیں۔

میری خالہ، میری خوش دامن:

میرے نانا حافظ مقصود علی کے کوئی بیٹا نہ تھا صرف دو بیٹیاں تھیں، ایک عزیز النساء میری والدہ، دوسری لطیف النساء میری خالہ یعنی سلمیٰ کی والدہ، سلمیٰ کی داد ھیال میں چونکہ کفالت و نگرانی کرنے والا کوئی نہ تھا اس لئے وہ شروع ہی سے نانا کے گھر میں رہیں، وہیں پلی بڑھیں اور ان کی

تعلیم وتربیت ہوئی۔ میری والدہ بھی اکثر نانا کے گھر جاتی رہتی تھیں چنانچہ ہم بھی نانا سے بہت مانوس تھے میری عمر سات آٹھ سال کی تھی کہ ان کا انتقال ہوا وہ ہمیشہ سفید پوش رہتے تھے، قد لمبا تھا سینہ چوڑا، داڑھی بالکل سفید قدرے لمبی، روزہ نماز کے پابند، ان کا نورانی چہرہ اب تک مجھے یاد ہے اور اب جب کبھی مجھے ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابوں کا ڈھیر یاد آتا ہے تو آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ سامنے آکھڑے ہو جاتے ہیں۔ سلمیٰ تو سرتاسر نانا کے گھر کی پروردہ ہیں۔

سلمیٰ اور سلمیٰ کے والد اور بھائی بہن

سلمیٰ کے والد دو بھائی تھے، مصاحب علی اور ممود علی۔ مصاحب علی میرے خالو تھے میری خالہ کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ سید عابد علی جعفری، سید بدر علی جعفری اور سلمیٰ وصفیہ۔ عابد علی جعفری اور سید بدر علی جعفری مڈل اسکول میں میر ساتھ رہے۔ ہم تینوں بھائی اسکول میں حساب دانی کے لیے مشہور تھے۔ تینوں نے درجہ اول میں مڈل پاس کیا تھا۔ سید عابد علی جعفری پولیس میں انسپکٹر آف پولیس رہے۔ سبکدوش ہو کر ناگپور میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ ان کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ سب سے بڑے ساجد علی بمبئی میں ٹیلیفون کے ڈویژنل انجینئر ہیں، زاہد علی جعفری اور شاہد علی جعفری دونوں ڈاکٹر ہیں اور محکمہ صحت میں ملازمت کے ساتھ ساتھ ماہرین صحت کی حیثیت میں اپنے اپنے مطب بھی کرتے ہیں۔ آصف علی ہنوز پڑھ رہے ہیں اور سیاسی وسماجی کارکن کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

عابد علی جعفری کی دونوں بیٹیاں بھی اپنے بھائیوں کی طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اپنا اپنا گھر بسائے ہوئے ہیں۔ آبائی وطن ایرایاں کو چھوڑ کر سب کے سب مستقلاً بمبئی اور ناگپور میں آباد ہیں۔ دسمبر ۱۹۹۱ء میں ادھر گیا تو سب سے ملاقات کر کے دل خوش ہوا۔ عابد علی جعفری کے دوسرے بھائی سید بدر علی جعفری پاکستان آگئے تھے، محکمہ ٹیلیفون سے وابستہ تھے اور ہر طرح خوش

تھے، لیکن جب دق کے موذی مرض نے یک بیک ایسا دبوچا کہ صرف پینتیس سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے لڈن اور جاوید نامی دو بیٹے ہیں دونوں فیض کالونی نمبر ۵ میں رہتے ہیں اور بحمداللہ خوش ہیں۔

میری خالہ کی دو بیٹیوں میں چھوٹی صفیہ ہیں، ان کا ذکر پچھلی سطروں میں کسی جگہ آچکا ہے خالہ کی بڑی بیٹی سلمیٰ میری بیگم ہیں اور مجھے زندگی میں جتنی خوشیاں اور کامیابیاں میسر آئی ہیں، ان میں زیادہ حصہ انہی کا ہے۔ ادیب اور میٹرک کے امتحانات میں پرائیویٹ طور پر امتحان میں شریک ہونے کے بعد جامعہ ملیہ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ سے پی ٹی سی کیا لیکن گھر کی ذمہ داریاں ایسی رہیں کہ نہ مزید رسمی تعلیم کا موقع ملا اور نہ ملازمت کی لیکن گھر کو اور بچوں کو انھوں نے اس خوش اسلوبی سے سنبھالا کہ مجھے ملازمت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم کے حصول اور شعر وادب کے شوق فضول سے لطف اندوز ہونے کا موقع بہرحال ملتا رہا۔ ادیبوں اور شاعروں میں گھر بار کی طرف سے بے نیاز گزرنے کا جو ایک طبعی میلان سا ہوتا ہے وہ نسبتاً کم لیکن مجھ میں بھی تھا۔ صبح گھر سے نکلنا، ملازمتوں کی ذمہ داریوں کیساتھ، کسی نہ کسی امتحان کی تیاری میں لگے رہنا، مشاعروں، تنقیدی نشستوں اور ادبی جلسوں میں بہر صورت شریک رہنا، اور اس طرح کی محفلوں کے انعقاد کے لیے خود کو بھی وقف رکھنا رات کو دیر سے گھر پہنچنا اور گھر پہنچ کر بھی لکھنے پڑھنے میں لگا رہنا میرے پاؤں کی ایسی بیڑیاں تھیں جن سے میں آج بھی آزاد نہیں ہو سکا۔

ایسے میں بیوی بچوں کو جتنا وقت مجھے دینا چاہیے تھا وہ میں کبھی نہ دے سکا لیکن سلمیٰ نے میری زندگی اور میرے گھر پر اپنے حسن انتظام اور حسن عمل سے ایسا پردہ ڈالے رکھا کہ میرے سوا کسی دوسرے کو میری کمزوریوں کی خبر نہ ہوئی اور لطف کی بات یہ ہے کہ مجھ میں خواہ مخواہ کی محفل آرائی اور غیر آراستہ و غیر منظم زندگی بسر کرنے کی جو عادت یا کیفیت پیدا ہو گئی تھی وہ سلمیٰ کے دم قدم

سے آج بھی برقرار ہے۔ یہ بات میرے لیے حد درجہ اطمینان و مسرت کا باعث ہے کہ بیٹیاں اور میرے بیٹے بحمد اللہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہر طرح آسودہ حال و خوش و خرم ہیں نیز اپنے اپنے شعبوں میں اپنی محنت و مہارت کے سبب امتیازی شان رکھتے ہیں لیکن جب میں ان کی تعلیم و تربیت اور پرداخت و نگہداشت پر غور کرتا ہوں کہ اس میں جتنا ہاتھ سلمیٰ کا ہے میرا نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ میرے علمی و ادبی شوق کی سیرابی اور تصنیفی و تالیفی مشغلوں میں یک گونہ کامیابی میں بھی میری محنت و ریاضت سے زیادہ سلمیٰ کی رفاقت و اعانت کو دخل ہے۔ حق یہ ہے کہ انہوں نے مجھے، میرے گھر کو اور میرے بچوں کو، خوشیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے بچوں کے ساتھ ہمیشہ خوش و خرم رکھے اور جب تک وہ اس دنیا میں رہیں ایک شہزادی کی طرح عیش و آرام کی زندگی بسر کریں کہ میں نے انہیں ہمیشہ محفل میں نہ سہی، تنہائی میں سہی، شہزادی بی بی کے نام سے پکارا ہے اور شہزادی ہی کی طرح رکھا ہے۔

④ ننھا دلدار

''میرا پیغام بچوں کیلئے نہیں بلکہ ان کے والدین اور معلمین کے لئے ہے میں نے پرائمری سے پی ایچ ڈی تک پڑھا ہے میں نے نفسیات بھی پڑھی ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں جتنی توجہ بچوں پر دینی چاہیے ہم اتنی نہیں دیتے۔ بچوں کی دلچسپیاں جبلی اور طبعی ہوتی ہیں، بچوں کو آپ جس چیز سے روکیں گے وہ اسے ضرور کرے گا۔ والدین اور اساتذہ کو سمجھنا چاہئے کہ بچے پودے کی مانند ہوتے ہیں۔ پودے کیلئے تیز ہوا، زیادہ پانی یا کم پانی نقصان دہ ہوتا ہے۔ پودے کی اگر صبح شام نگہداشت کی جائے تو کوئی ڈھنگ کا درخت بنے گا۔ ہمارے ہاں ابتدائی تعلیم افسوسناک ہے اس طرح بچے مرجھا جاتے ہیں''۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (۱۰)

ہم جب بڑے لوگوں، عظیم شخصیات، مدبر افراد اور مشہور زمانہ ہستیوں اور ان کے کارناموں کے دیکھتے ہیں تو ان کے بچپن کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ تصور کیا کرتا ہمارے تصور سے تو فزوں تر ہے یہ نظارہ کہ کبھی ان کی ناک بہتی ہوگی۔ بھوک سے روتے ہوں گے، شرارت پر پٹتے ہونگے اور گلی کی لڑکوں سے لڑتے ہوں گے۔

اسی لئے ڈاکٹر، پروفیسر، محقق، ناقد، مقرر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے سر کی چاندی کو دیکھ کر ننھے دلدار کا تصور کرنا محال ہے اب اسے حسن اتفاق ہی سمجھئے کہ ڈاکٹر فرمان صاحب نے اوائل عمر کے بارے میں دو مضامین قلم بند کیے ہیں۔ ''بچپن اور لڑکپن کی کچھ یادیں'' ڈاکٹر خلیق انجم کی مرتبہ ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری، شخصیت اور ادبی خدمات میں اور تنویر ظہور کی مرتبہ ''میرا بچپن'' میں بلا

عنوان بچپن کا مختصر احوال قلم بند کیا ہے ان دونوں مضامین کی روشنی میں ولدارعیا ایسے نظر آتے اور یوں بچپن کی روداد سناتے ہیں:

غالب کا دیوان اور کھیرا

میں ایک چھوٹے سے گاؤں بیت پور سادات فتح پور میں پیدا ہوا۔ اس گاؤں سے ہندوؤں کے بڑے بڑے قصبے ملے ہوئے تھے۔ ہمارے علاقے میں عام طور پر پرانی طرز کے تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ کوئی پرائمری پاس، کوئی مڈل، کوئی اردو جاننے والا تو کوئی عربی۔ انگریزی جاننے والے ایک آدھ تھے۔

میرے والد صاحب فارسی بہت اچھی جانتے تھے، انہیں مثنوی روم پڑھنے میں خاص مہارت تھی۔ مجھے سب سے پہلے فارسی پڑھائی گئی۔ پھر مثنوی مولانا روم یاد کرائی گئی۔ پھر گلستان بوستان پڑھائی گئی۔ ہمارے خاندان میں قرآن کے حافظ بہت تھے انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ہمارے اباجی نے جہاں ہمیں فارسی پڑھائی وہاں حافظ کی طرف بھی راغب کیا۔ چنانچہ میں نے قرآن کے چودہ پارے حفظ کر ڈالے۔ مکمل قرآن اس لئے حفظ نہ کر سکا کہ جب میں ۹، ۱۰ سال کا تھا تو میرے والد انتقال کر گئے۔

ہمارے قصبے کے مشاغل میں کشتی کے فن کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ورزش کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ اکھاڑے بنے ہوئے تھے۔ وہاں کے میلوں میں کشتیوں کے دنگل ضرور ہوتے تھے۔ میں بھی وہاں کشتیوں میں حصہ لیتا تھا۔ ہم اکھاڑے میں کشتی سیکھنے جاتے تھے۔ میٹرک تک میں ممتاز طریقے سے کشتی لڑتا رہا۔

ریاضی دان

مڈل اسکول میں ہمارے ایک استاد ریاضی پڑھاتے تھے وہ کشتی ضرور لڑاتے تھے۔ تمام طلباء کو اکھاڑے لے جاتے تھے۔ مجھے ایک بار انھوں نے دنگل والی کشتی ہندو جاٹ سے لڑوا دی۔ میرے پاس ایک دو خاص داؤ تھے (اب بھی کسی سے جھگڑا ہو جائے تو وہ داؤ استعمال کرتا ہوں) میں نے ہندو جاٹ پر اپنے داؤ استعمال کئے مگر وہ میرے قابو نہ آیا۔ ہم دونوں اس کوشش میں تھے کہ کوئی ذرا گردن نیچی کرے تو مُکا رسید کر دے ہم دونوں دس پندرہ منٹ تک پیشانیاں رگڑتے رہے یہاں تک کہ پیشانیوں سے خون رسنے لگا۔ آخرکار یہ کشتی برابر چھڑا دی گئی۔

یہ واقعات ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء کے درمیان کے ہیں۔ ہمارے قصبے میں لکڑی کا فن، حافظ، کشتی اور شاعری ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ مجھے دو چیزوں سے خاص دلچسپی رہی ایک زبان و ادب اور دوسرے ریاضی۔ ہمارے متعدد اساتذہ مسلمان طلباء کو ریاضی اور عام تعلیم سے بدظن کرتے تھے۔ عام طور پر مسلمان طلباء ریاضی سے بھاگتے تھے ہمارے خاندان کے تمام لوگ ریاضی دان کہلاتے تھے میں نے ایف اے تک ریاضی پڑھی۔ ریاضی کے پرچے میں دس میں سے پانچ سوال حل کرنے ہوتے تھے مگر میں دس سوال حل کرتا تھا اور اوپر لکھتا تھا کوئی سے پانچ سوال دیکھ لیجئے۔

تمام سوال حل کرنے کا معاملہ صرف ریاضی تک رہا کیونکہ باقی مضامین میں اتنا وقت نہیں ہوتا کہ بھی سوال حل کئے جاتے۔ میرے سب سے زیادہ نمبر ریاضی اور اردو میں آتے تھے۔ غالب کا دیوان مجھے پورا یاد تھا۔ میٹرک تک تمام استاد شعراء کے چیدہ چیدہ شعر یاد کئے اور ان اشعار کو بیت بازی کے مقابلوں میں استعمال کرتا رہا۔ تنقیدی مضامین سب سے پہلے غالب پر لکھے۔

کھیل اور تاریخ

میں بچپن میں ہاکی، کرکٹ اور کبڈی کھیلتا تھا۔ بیت بازی میں بہت دلچسپی لی۔ ڈبیٹ اور بیت بازی میں کرتا دھرتا ہوتا تھا۔ جگر مرادآبادی ہمارے سکول کے مشاعروں میں اکثر آیا کرتے تھے۔ ایک بار اسکول کے سالانہ مشاعرے میں جگر صاحب صدارت کر رہے تھے تو فی البدیہہ تقریر کے لئے موضوع دیا گیا: "شاعری تضیع اوقات ہے"۔ میں نے موضوع کی حمایت میں تقریر کی۔ مجھے پہلا انعام دیا گیا۔ جگر صاحب بہت خوش ہوئے انھوں نے اپنے ہاتھ سے مجھے انعام دیا۔

بچپن سے ہی شاعری گھٹی میں پڑ گئی تھی۔ نثر لکھنے کا شوق تو بعد میں ہوا۔ میں اپنے قصبے کا مشہور شاعر تھا۔ بلکہ کہ کئیوں کو لکھ کر دیتا تھا، مجھے اپنے شعر شائع کرنے کا شوق نہیں تھا اس لئے میرے پاس شاعری محفوظ نہیں۔ بعد میں مضمون لکھنے کا شوق تھا کہ جس نے ریاضی کے شوق پر ادبیات کو حاوی کر دیا۔ پہلے تنقیدی مضمون لکھے پھر تحقیق کی طرف آ گیا۔ شاید ریاضی میں دلچسپی کی وجہ سے تحقیق کا شوق پیدا ہوا۔

بچپن کا ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔ مجھے پیراکی پوری طرح نہیں آتی تھی میں ایک بڑے تیز نالے میں کود گیا۔ پانی بہت تیز بہہ رہا تھا جب میں ایک دو منٹ نظر نہ آیا تو میرے ساتھیوں کو فکر لاحق ہوئی۔ وہ پیراکی میں مہارت رکھتے تھے انھوں نے مجھے باہر نکالا۔ یہ ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والا حادثہ تھا مگر میں زندہ نکل آیا اس وقت میری عمر تقریباً چودہ پندرہ برس تھی۔

ایک واقعہ تو دس سال کی عمر کا ہے۔ میرے والد انسپکٹر پولیس تھے۔ وہ ریٹائر ہو کر گاؤں آ گئے تھے تو ایک دن میرے پیٹ میں سخت درد اٹھا۔ یہ درد تین چار دن جاری رہا اس زمانے میں آج کی طرح طبی سہولتیں نہیں ہوتی تھیں تمام علاج کئے افاقہ نہ ہوا۔ میں درد کے دوران اپنی

ماں سے کھیرا کھانے کی فرمائش کرتا۔ کھیرے کی فصل تھی۔ ہم لوگ مکئی اور کھیرا بہت کھاتے تھے۔ جب میرے والد نے سمجھ لیا کہ میں مرنے کے قریب ہوں تو انھوں نے مایوس ہو کر میری کھیرے والی فرمائش پوری کر دی۔ جب میں نے دو تین کھیرے کھائے تو مجھے افاقہ ہو گیا۔ میرے والدین اور بھائی بہت حیران ہوئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ کھیرا اور خربوزے کے بیج ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ میں اب بھی کھیرا بہت شوق سے کھاتا ہوں۔

جانوروں کی معیت میں

میرا بچپن میرے دوسرے بھائی بہنوں کی بہ نسبت زیادہ لاڈ پیار میں گزرا۔ وجہ یہ تھی کہ میں ان میں سب سے چھوٹا تھا۔ والد صاحب جنہیں میں اباجی کہتا تھا۔ پولیس میں سب انسپکٹر تھے میں دو تین برس کا تھا کہ وہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے آبائی گاؤں میں آ گئے تھے اور نیا گھر بنوا کر مستقل رہنے لگے تھے۔

اباجی، فارسی اور اردو کے ساتھ ہندی بھی اچھی جانتے تھے۔ خاص طور پر فارسی سے انہیں گہری دلچسپی تھی گلستان بوستان اور کریما کے بیشتر اجزاء ان کو زبانی یاد تھے۔ مولود شریف کی محفلوں میں وہ مولانا روم کی مثنوی بھی خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے بھی فارسی کے بہت سے اشعار اور مقولے بچپن ہی میں ازبر ہو گئے تھے۔ چار پانچ سال کی عمر سے وہ مجھے قرآنی آیات بھی زبانی یاد کرانے لگے تھے۔ چنانچہ میں نے سال کی عمر میں ناظرہ ختم کر کے کچھ پارے حفظ کر لئے تھے۔

گھر میں دو طوطے، ایک بندر، دو تین دودھ دینے والی بکریاں، ایک گائے، ایک بھینس اور ایک مینڈھا پلا ہوا تھا۔ میں انہی کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا کہ میری عمر کا کوئی دوسرا بچہ گھر میں نہ تھا۔ بندر کے رہنے کیلئے گھر کے صحن میں ایک اونچا بانس گڑا ہوا تھا جس کے اوپر ایک مچان

سا بنا دیا گیا تھا۔ بندر ڈھیلی زنجیر سے اس طرح بندھا رہتا تھا کہ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر آتا جاتا رہتا تھا۔ اگر کبھی زنجیر کی قید سے نکل بھاگتا تو اچھل کود سے سارے گاؤں کو پریشان کر دیتا اور مشکل سے قابو میں آتا تھا۔ مینڈھا چھوٹے قد کا تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سے سفید نرم بال مجھے بھی اچھے لگتے تھے۔ اس کے سر پر اندر کو مڑی ہوئی چھوٹی چھوٹی دو سینگیں بھی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ یہ سینگیں بظاہر بے خطر تھیں لیکن جب مینڈھا کسی کو سر مارنے پر آتا تھا تو جان کے لالے پڑ جاتے تھے۔ مجھ پر ایک بار خطرناک حملہ کیا تھا لیکن میں نے شور مچایا تو ایک چرواہے نے مجھے بچا لیا۔

والد کا انتقال

گھر کا یہ ماحول بہت دنوں قائم نہ رہ سکا۔ ۱۹۳۳ء میں جبکہ میری عمر صرف سات سال کی تھی ابا جی ہم سے ہمیشہ کیلئے روٹھ گئے۔ ان کی اچانک وفات کی وجہ مجھے یہ بتائی گئی کہ میرے سب سے بڑے بھائی ہیضے کی وبا کا شکار ہو کر یکا یک عین جوانی میں انتقال کر گئے اور یہ صدمہ میرے ابا جی زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکے۔

ابا جی کی وفات کے بعد گھر کا شیرازہ بہت جلد بکھر گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابا جی کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا اور ہمارا گھر ان کے دوستوں اور عزیزوں کیلئے ایک طرح کا مہمان خانہ بنا رہتا تھا۔ گھر کے اخراجات اس قدر بڑھ گئے تھے کہ نقدی اثاثہ ابا جی کی زندگی میں تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ زمینداری تھی لیکن ڈھنگ سے زندگی گزارنے کیلئے کافی نہ تھی۔

ابا جی کے انتقال کے تین سال بعد میری بڑی بہن بھی تقریباً جوانی میں بیوہ ہو گئیں۔ ان کی اور ان کے تین بچوں کی پرورش بھی میرے بڑے بھائی اور والدہ کو کرنی پڑی۔ میری والدہ جنہیں ہم بی بی کہتے تھے اپنے خاندان کی سب سے سیدھی سادھی شریف خاتون سمجھی جاتی تھیں۔

نہ کبھی کسی کی برائی میں منہ کھولا اور نہ کسی کا کبھی احسان لیا۔ ابا جی کی زندگی میں مالی اعتبار سے ہمارے گھر کا جو بھرم قائم ہو گیا تھا اسے عمر بھر برقرار رکھا۔ تنگی ترشی کے زمانے میں بھی انہوں نے کبھی کسی سے قرض نہیں لیا تھا بلکہ جو لوگ ہمارے گھر سے قرض لینے کے عادی ہو گئے تھے انہیں وہ اپنی تنگدستی کے باوجود کچھ نہ کچھ دے دیا کرتی تھیں۔ بڑی بہن اور بڑے بھائی ایسا کرنے سے منع کرتے تو سمجھا کر کہتی تھیں ممکن ہے یہ لوگ ہم سے بھی زیادہ ضرورت مند ہوں۔ دوسرے یہ کہ ان کی ضرورت پوری کرنے سے ہمارے گھر کی لاج باقی رہتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ لوگ ہمیں پہلے کی طرح آج بھی بہت خوشحال سمجھتے ہیں۔ اگر ان پر یہ راز کھل جائے کہ اب ہم کسی کو کچھ دینے کے لائق نہیں رہے تو یہ کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔ خواہ مخواہ لوگ ہم پر ہنسیں گے اور ہمیں حقیر جانیں گے۔ اب غور کرتا ہوں تو ان کی یہ باتیں شیخ سعدی کے اس قول کے عین مطابق نظر آتی ہیں کہ اپنی تنگدستی یا کمزوری کا اظہار دوسروں پر کرنا ہم چشموں اور ہمسایوں سے اپنا مذاق اڑانا ہے۔

والدہ محترمہ کی اس تربیت نے مجھ میں اور بڑے بھائی میں غیرت اور خودداری کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا کہ خراب سے خراب حالات میں بھی ہم نے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اور پوری دیانت اور محنت کے ساتھ حالات کو سدھارنے کی کوشش میں لگے رہے۔ اس کوشش میں بڑے بھائی کو تعلیم چھوڑنی پڑی لیکن ان کی یہی قربانی میرے لئے تعلیم جاری رکھنے کا وسیلہ بن گئی۔ چنانچہ انہوں نے مجھے تقریباً سات سال کی عمر میں یعنی ابا جی کی وفات کے فوراً بعد ۱۹۳۳ء میں پرائمری اسکول میں داخل کرا دیا۔

چوتھی جماعت کا امتحان وظیفے کے ساتھ پاس کر کے میں مڈل سکول میں داخل ہوا۔ مڈل کے امتحان میں پورے ضلع میں اول آیا اور پہلے دو سال چھ روپے پھر آٹھ روپے مہینے کے سرکاری وظیفہ ملنے لگا۔ اس طرح میرے لئے ہائی اسکول میں داخلہ لینے اور تعلیم کو جاری رکھنے کی

صورت پیدا ہوگئی۔ لیکن میرے خیال میں بچپن کا زمانہ پرائمری اسکول پر اور لڑکپن مڈل اسکول پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کی زندگی کو بچپن یا لڑکپن کا نام دینا مناسب نہ ہوگا۔ اس لئے میں صرف اسی دور تک کی جو باتیں مجھے یاد ہیں وہی بیان کروں گا۔

بچپن کے تعلق سے پانچ سال کی عمر تک جو واقعات مجھے اچھی طرح یاد ہیں ان میں ایک تو ۳۲۔۱۹۳۱ء میں کانپور کا ہندو مسلم فساد ہے۔ میں اباجی کے ساتھ پہلی بار کانپور گیا تھا۔ حمزہ بابو کی کوٹھی کے قریب بیر امن پورہ میں رہتا تھا حالانکہ میرے گھر کے پاس مسلمانوں کی اکثریت تھی پھر بھی پورا محلہ خوفزدہ سا رہتا تھا۔ شہر میں جس انداز میں لوٹ مار ہو رہی تھی اسے دیکھ کر میں سہما رہتا تھا، چنانچہ ضد کر کے بہت جلد والدہ کے پاس گھر واپس آ گیا تھا۔

ایک اور واقعہ مار پٹائی کے حوالے سے یاد آ رہا ہے۔ میرا گاؤں دریائے گنگا کے کنارے واقع تھا اباجی شادی کی ایک دعوت میں گنگا کے اس پار ریاں نامی قصبہ جا رہے تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ میں شادی میں جانے کے لئے ضد کر رہا تھا۔ اباجی نے پہلے تو سمجھایا بجھایا پھر تھانیداری والے دو تین بید رسید کئے۔ میں چیختا چلاتا گھر واپس پہنچا اور والدہ کی گود میں بہت دیر تک سسکتا رہا۔

فارسی اشعار سے رغبت

مجھے فارسی کے متعدد اشعار خصوصاً نعتیہ اشعار اور کریما و گلستان و بوستان کے بہت سے ٹکڑے چھ سات سال کی عمر میں زبانی یاد ہو گئے تھے، یہ اباجی کیساتھ ہر وقت رہنے کا فیضان تھا۔ اباجی مجھے زیادہ سے زیادہ اشعار زبانی یاد کرانا چاہتے تھے اور میں بھی پوری دلچسپی لیتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی کتاب ''اردو کی نعتیہ شاعری'' کے مقدمے میں فارسی کے جو اشعار نقل کئے ہیں وہ عموماً بچپن ہی کی یادوں کا سرمایہ ہیں۔

ایک اور واقعہ پوری وضاحت کے ساتھ میرے ذہن میں محفوظ ہے یہ واقعہ مذہبی نوعیت کا تھا اور جس عمر میں یہ میرے مشاہدے میں آیا شاید وہ عمر نفسیاتی اعتبار سے اس کس قسم کے مذہبی واقعات کو دل و دماغ میں طاری کر لینے کی مناسب ترین عمر ہوتی ہے، اسی لیے مجھے یقین ہے کہ میں اس جگہ جو واقعہ بیان کر رہا ہوں وہ میری عمر کے بہت سے ذہنوں میں محفوظ ہوگا وجہ یہ ہے کہ یہ واقعہ مختصر نہیں اپنے وقوع میں بہت طویل ہے اور شیر شاہ کی بنوائی ہوئی مشہور گرانڈ ٹرنک روڈ کے تعلق سے پاک و ہند کی طویل علاقے پر پھیلا ہوا ہے۔

۳۳۔۱۹۳۲ء کی بات ہے سہسرام (صوبہ بہار) کے ایک درویش صفت مسلمان نے زیارت بیت اللہ کی غرض سے پیدل چل کر مکہ مکرمہ پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ بیت اللہ کے اس پیادہ مسافر کا نام سبحان احمد تھا۔ سفر کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر پانچ قدم پر دو رکعت نفل پڑھتے تھے۔ ظاہر ہے ایک میل کا سفر گھنٹوں میں طے پاتا تھا۔

جس علاقے سے گزرتے، ان کو دیکھنے، ان سے مصافحہ کرنے، ان کی دست بوسی اور گل پاشی کیلئے دور دور سے ہزاروں مسلمان گرانڈ ٹرنک کے کنارے کنارے صف بستہ ہو جاتے تھے۔ ان میں عام و خاص ہر قسم کے لوگ ہوتے تھے اور جگہ جگہ اس سلسلہ میں استقبالیہ جلسے منعقد کئے جاتے تھے۔ چنانچہ جب وہ ہمارے گاؤں کے قریب سے گزرے تو دوسروں کے ساتھ میں بھی کئی میل تک ان کے ساتھ گیا۔ بڑے بھائی نے ان کی شان میں ایک نظم کہی۔ نوح ناروی کے ایک مشہور شاگرد اور صوفی بزرگ جناب عبدالرؤف رسوا ان دنوں ہمارے ہاں مقیم تھے۔ انھوں نے سبحان احمد صاحب کی مدح میں متعدد نظمیں کہیں۔ ان کے شاگردوں میں میرے چچا سید صدیق حسن اور محمد بسود گوتی کے حافظ عبدالغفور تاج نے بھی قصاید لکھے۔ یہ ساری چیزیں الگ الگ پمفلٹ کی شکل میں شائع کی گئی تھیں ان میں سے بعض مطبوعہ صورت میں آج بھی میرے پاس

موجود ہیں۔

اب جب بھی سبحان احمد صاحب مجھے یاد آتے ہیں تو سوچا کرتا ہوں کہ جب سفر کیلئے آسان ذرائع موجود تھے اور سبحان احمد صاحب، سفر کے اخراجات برداشت کرنے کی حیثیت بھی رکھتے تھے تو آخر پیدل چل کر اور وہ بھی ہر قدم پر دو رکعت نفل پڑھتے ہوئے، حج کرنے کا ارادہ کیوں کیا؟ مجھے معلوم نہیں وہ مکہ مکرمہ تک پہنچے۔ پہنچے بھی تو کب، کتنی مدت میں اور کس طرح واپس ہوئے۔ سسہرام (بہار) کے بہت سے لوگ پاکستان میں موجود ہیں انہیں ان کا حسب نسب ضرور معلوم ہوگا اور وہ شاید اس سے بھی باخبر ہوں گے کہ آخر بیت اللہ کے اس مسافر پر کیا گزری؟ بہر حال چونکہ اپنی نوعیت کا یہ ایک عجیب واقعہ تھا اور میرے لئے حیران کن بات بھی، اس لئے ذہن میں اس طرح بیٹھ گیا تھا کہ آج تک ہر بات پوری جزئیات کے ساتھ یاد ہے۔ اب بھی اگر کسی صاحب کو سبحان احمد کے بارے میں واقعی علم ہو اور وہ اس کی تفصیلات بتاسکیں تو شاید ان کی داستان بڑی دلچسپ ہوگی۔

موسموں میں زندگی

گاؤں اور قصبے کی زندگی بھی عجیب و غریب ہوتی ہے۔ بارش، سردی اور گرمی کے موسموں کا اثر۔ وہ بارشوں میں دیر تک بھیگنا، دوسروں پر پانی پھینکنا، مچھلیاں پکڑنا، جھولے ڈالنا، پتنگیں بڑھانا، اونچے درختوں پر چڑھ کر آم اور جامن توڑنا، میلوں ٹھیلوں اور دنگلوں میں جانا اور ان میں خرچ کرنے کے لئے ضد کرکے امی ابو سے پیسے لینا بھی، امیر و غریب ہر گھر کے بچے کا محبوب مشغلہ تھا۔

یہ ساری باتیں بچوں کے کھیل کود اور تفریح کا حصہ ہوتی تھیں۔ سردی میں صبح سویرے بیر کے شکار کیلئے ٹولیاں بنا کر نکلنا، شام کو الاؤ لگانا، اس کے ارد گرد بیٹھ کر رات گئے تک آگ تاپنا،

کہانیاں سننا اور سنانا، جنگ نامہ اور شاہنامہ، کبھی زبانی اور کبھی پڑھ کر، الاپنا توشنگی اور اتائیوں کا تماشا دیکھنے کیلئے دور دراز کا سفر کرکے پیدل چلنا، تل کے لڈو اور باجرے کے آٹے کی ٹکیاں ذوق وشوق سے پکوانا، خود کھانا اور دوسروں کو کھلانا بھی عام تھا، ہر گھر کے لڑکے بچے، بڑوں کے ساتھ ان مشغلوں میں کسی نہ کسی طور پر شریک رہتے تھے۔

گرمی کے موسم میں کبھی مکان کی چھت پر، کبھی گھر کے باہر، میدان میں اور کبھی کھیت کھلیان میں بھی سلائی ہوتی تھی۔ تربوز، خربوزے، ککڑی اور مونگ پھلی کے کھیتوں میں سونا یوں ضروری تھا کہ اس کے بغیر فصلیں گیدڑوں سے محفوظ نہ رہ سکتی تھیں۔ میرا بچپن اور لڑکپن دیہات کے ایسے ہی ماحول میں گزرا ہے اور میں نے اس ماحول کے سارے مشغلوں میں سے ہر ایک میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ ان میں ایک دو واقعات ایسے پیش آئے ہیں کہ اب تک مجھے یاد ہیں اور شاید عمر بھر یاد رہیں گے۔

شجر پیا

ابا جان کی وفات کے بعد میرے دو چچا، کلکتے کی تجارتی شپ کمپنی میں ملازم ہو گئے تھے اور عموماً یورپ، امریکا اور جاپان کے سفر میں رہتے تھے۔ سال دو سال میں واپس آتے تھے اور جب ہمیں وہاں کی ترقی یافتہ زندگی کی تفصیل بتاتے تھے تو ہم بڑی حیرت سے اسے کہانی سمجھ کر سنتے تھے۔ البتہ ایک چچا جن کا ڈیل ڈول دیکھنے کے لائق تھا مستقلاً گاؤں میں رہتے تھے اور اپنے چاروں بھائیوں کے گھر کا انتظام بھی دیکھتے تھے۔ گویا وہ سارے خاندان کے بچوں اور لڑکوں کے مقامی گارجین یا سرپرست تھے، ندی اور تالاب میں نہانے اور جامن اور آم کے درختوں پر چڑھنے سے ہر لڑکے کو بہت سختی سے منع کرتے رہتے تھے اور اگر کوئی ایسا کرتے ہوئے پکڑا جائے تو اس کی مرمت کرتے تھے۔ پھر بھی ہم اس کام سے باز نہ آتے تھے۔ جوں ہی پتا چلا کہ وہ دوپہر

میں مصروف ہیں یا گاؤں سے باہر گئے ہوئے ہیں یا کسی ایسے کام میں مصروف ہیں کہ تالاب اور باغ کا رخ نہ کریں گے تو ہم تالاب میں نہانے اور جامن یا آم توڑنے کے لئے دوڑ پڑتے تھے۔ کبھی ضرورتاً اور بیشتر بے ضرورت درختوں پر چڑھ جاتے تھے، ایسا کرنے میں ایک دفعہ تو میں جامن کے پیڑ سے گرا اور ایک بار آم کے پیڑ سے۔ آم کے پیڑ سے گرنے میں یہ ہوا کہ میرا دایاں ہاتھ کاندھے کے پاس سے اکھڑ گیا۔ بدن کے اکثر حصوں میں سخت چوٹیں آئی تھیں لیکن ہاتھ کا معاملہ بہت خطرناک ہو گیا تھا۔ درد بہت شدید تھا اور ہاتھ اٹھائے نہ اٹھتا تھا۔ والدہ کو خبر ہوئی تو انھوں نے چچا کو اطلاع کرائی اور میری دیکھ بھال کے لئے بھیجا۔ چچا جان غصے میں بھرے ہوئے آئے نہ میرا حال پوچھا اور نہ میری حالت دیکھی، دو تین ہاتھ رسید کئے اور جس ہاتھ میں چوٹ آئی تھی اس کو پکڑ کر گھسیٹا اور یہ کہنے لگے "میں نے منع کیا تھا کہ پیڑ پر مت چڑھنا اب بھگتو" یعنی انھوں نے مجھے تسلی دینے یا میرا حال معلوم کرنے کی بجائے میری مزید مرمت کر دی۔ پھر بھی ان کا یہ عمل اتفاق سے میرے لئے فائدہ مند ثابت ہوا جس ہاتھ کی ہڈی، شانے کے پاس سے اکھڑ گئی تھی یعنی جگہ سے بے جگہ ہو گئی تھی وہ ان کے جھٹکوں اور مار کٹائی سے خود بخود اپنی جگہ پر آ گئی اور اس طرح مجھے ہاتھ کے ناقابل برداشت درد سے بہت جلد نجات مل گئی۔

حلق میں پیسہ

یہی چچا جو سارے خاندان کے بچوں کے نگران تھے ایک بار اور مصیبت میں کام آئے۔ ہوا یہ کہ مجھے دو تین پیسے بازار سے گنا خریدنے کے لئے امی سے ملے تھے۔ یہ پیسے تانبے کے تھے اور ان پر انگلستان کے جارج پنجم کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ میں ان پیسوں سے کھیل رہا تھا اور جیسا کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے انھیں بار بار منہ میں ڈال رہا تھا۔ ایک پیسہ اچانک میرے حلق کے اندر چلا گیا اور اس میں پھنس گیا۔ میں گھگھیانے لگا، آنکھیں باہر نکل آئیں اور یوں لگتا تھا جیسے

اب جان سے گیا۔ چچا نے پہلے تو میری گردن اور گدی پر تیزی سے دو تین دوہتڑ لگائے۔ اس پر بھی پیسہ حلق سے پیٹ کے اندر نہ گیا تو انھوں نے مجھے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھایا اور کئی فٹ کی بلندی سے پیروں کے بل چھوڑ دیا۔ یہ عمل انھوں نے دو تین بار کیا اور ایسا کرنے سے پیسہ پیٹ کے اندر چلا گیا۔ تماشہ دیکھنے والوں نے اس طرح میری جان بچانے پر چچا کی ذہانت اور محبت دونوں کی داد دی۔

کھیرے کا رسیا

بچپن کا ایک اور واقعہ مجھے نہیں بھول سکتا۔ اباجی ابھی حیات تھے اور میری عمر سات سال سے زیادہ نہ تھی ایک دن پیٹ میں بہت زور کا درد اٹھا اور بڑھتا ہی چلا گیا۔ میرے ایک چچا طبیب بھی تھے، انھوں نے بدل بدل کر کئی دوائیں دیں لیکن فائدہ نہ ہوا۔ باہر سے طبیب بلائے گئے۔ ان کی دوائیں بھی کارگر ثابت نہ ہوئیں۔ بے چینی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، میرے بڑے بھائی، بڑی بہن، اباجی اور امی بار بار مجھے گود میں لے کر اپنے سینے سے رات دن لپٹائے رہتے۔ ذرا دیر کو نیند ہی آ جاتی لیکن آنکھ کھلتے ہی تڑپنے لگتا۔ کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ کس چیز کا اور کس قسم کا درد ہے۔ آخر کار طبیبوں نے جواب دے دیا۔ میں روز بروز نڈھال ہوتا گیا اور ہفتے کے اندر میری حالت یہ ہو گئی کہ لوگ میری زندگی سے بالکل مایوس ہو گئے۔

میری مشکل آسان کرنے کیلئے اللہ سے دو دعائیں مانگی جانے لگیں جو زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا بیمار کیلئے بہت سادہ اور ہلکی پھلکی غذا کبھی کبھی دی جاتی تھی، حالانکہ میں مختلف قسم کے کھانے اور پھل وغیرہ رو رو کر مانگا کرتا تھا لیکن اس ڈر سے کہ کہیں درد اور بڑھ نہ جائے مجھے دال اور دلیا کے سوا کوئی چیز نہ دی جاتی تھی۔

جب میرے جینے کی آس نہ رہی تو آخر میں طبیبوں اور عزیزوں نے اجازت دے دی

کہ جو چیز کھانے کے لئے مانگیں دے دی جائے یعنی موت سے پہلے ہر قسم کی خواہش پوری کر دی جائے۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا کھاؤ گے میں نے کہا کھیرا۔ کھیرے کا نام یوں لیا کہ کھیرے کی فصل تھی اور جب دوسرے بچے کھیرا کھاتے نظر آتے تو مجھے بڑی لالچ آتی تھی اور اندر سے کھیرا کھانے کی غیر معمولی خواہش پیدا ہوتی تھی میری آخری خواہش کا لحاظ رکھ کر مجھے ہرے کچّے تازہ اور ملائم کھیرے کی چند قاشیں دے دی گئیں۔ میں نے جیسے ہی کھایا مجھے ایک طرح کا سکون محسوس ہوا، میں نے مزید کھیرا طلب کیا۔ میرے سامنے بہت سے کھیرے کاٹ کر رکھ دیئے گئے۔ خدا کا کرنا دیکھو کہ جیسے جیسے میں کھیرے کھاتا گیا مجھے افاقہ ہوتا گیا۔ تھوڑی دیر میں میرے پیٹ کا درد غائب ہو گیا اور سارے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کھیرے کی یہ کرامت، کھیرا کھاتے وقت مجھے آج بھی یاد آجاتی ہے، بعد میں طبیبوں سے معلوم ہوا کھیرے اور کھیرے کے بیج پیٹ کی بہت سی بیماریوں کیلئے بہت مفید ہیں۔

آب گزیدہ

ہر چند کہ میرا گاؤں دریائے گنگا کے کنارے واقع تھا اور برسات کے موسم میں تین چار مہینے بارش کا ایسا زور دار سلسلہ رہتا تھا کہ ندی نالے اور تالاب اُمنڈ پڑتے تھے۔ ایسے میں گاؤں کے سبھی لوگ پیراکی سے خوب واقف ہوتے تھے لیکن مجھے پوری طرح پیرنا نہ آیا۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک ندی میں دور تک بہہ گیا تھا اگر ندی کے کنارے کے ایک پیڑ کی جڑ میرے ہاتھ نہ آجاتی اور میرے چچا زاد بھائی میرا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے مجھے نہ کھینچ لیتے تو میرا خاتمہ ہو گیا تھا۔ پیراکی سے ناواقفیت یا گہرے پانی سے ڈرنے کا ایک سبب بھی تھا۔

میرے گھر کے بالکل سامنے اور قریب ہی ایک پختہ کنواں تھا سارا گاؤں اسی سے پینے کا پانی حاصل کرتا تھا۔ پانی خاص گہرائی میں تھا اور رسی میں ڈول، گھڑا یا بالٹی باندھ کر کھینچا جاتا تھا۔

کبھی کبھی رسی کے ٹوٹ جانے یا ہاتھ سے ڈول اور بالٹی کے چھوٹ جانے سے پانی بھرنے والے کی جان جوکھوں میں پڑ جاتی تھی، چنانچہ خدا بخش نامی ایک نداف کے ساتھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا وہ کنویں میں گر گیا اور سارے گاؤں میں اس کی موت سے کہرام مچ گیا۔ لاش میرے سامنے نکالی گئی۔ میری عمر اس وقت چار پانچ سال تھی۔ اس واقعے کا خوف ایسا سمایا کہ گہرے پانی سے ہمیشہ ڈرتا رہا اور شاید اسی لئے ماحول کی سازگاری کے باوجود مجھے اور تو بہت کچھ آ گیا پیراکی کا فن نہ آیا۔

بنوٹ بازی

میرے گاؤں اور آس پاس کے علاقوں بلکہ فتح پور، کانپور، الٰہ آباد، رائے بریلی، اناؤ، پرتاب گڑھ یعنی اودھ کے اکثر اضلاع اور قصبات کے مسلمانوں میں حفظ قرآن، شاعری، پہلوانی، اور بنوٹ بازی کے مشاغل خاص طور پر مقبول تھے چنانچہ میرا بچپن اور لڑکپن بھی اسی ماحول میں گزرا۔ ہر مشغلے سے تھوڑی بہت دلچسپی رہی، شعر بہت کم عمری سے یعنی چوتھی پانچویں جماعت سے کہنے لگا تھا۔ چنانچہ فتح پور کے مشہور قصبہ ہتگام میں جس کے تعلق سے نشتر ہتگامی اور اقبال ماہتگامی شہرت رکھتے ہیں، ضلع بھر کے اسکولوں کا ایک ٹورنامنٹ ہوا۔ اس میں کھیل کود کے ساتھ مشاعرہ کا بھی اہتمام تھا۔ ہتگام میں بندر بکثرت تھے اور ہر آدمی کو ان کے حملوں سے ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا تھا میں نے اس بات کو سامنے رکھ کر کچھ اشعار کہے تھے۔ ان اشعار میں یہ شعر بہت مشہور ہوا تھا اور مجھے پہلا انعام ملا تھا:

واہ واہ کیا قصبہ ہتگام ہے
بندروں کا یاں ہجوم عام ہے

بنوٹ بازی یعنی لکڑی سے وار کرنے اور دوسروں کے وار سے بچنے کے فن سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ وجہ یہ تھی کہ قصبات اور شہر، دونوں کی زندگی میں اس وقت اس کی سخت ضرورت

رہتی تھی۔

فسادات میں قرولیاں، گپتیاں اور چھری چاقو تو بعد میں نکلتے تھے، پہلے لاٹھیوں اور ڈنڈوں ہی سے کام لیا جاتا تھا۔ زمینداری اور زمیندار ہونے کا بھرم رکھنے کیلئے بھی اس کی ضرورت ہر وقت رہتی تھی۔ کھیت کھلیان کے جھگڑوں کو طے کرنے، جانوروں کے چوری ہو جانے اور کشتی کے دنگلوں کے سلسلے میں تو لٹھ کا چل جانا عام بات تھی۔

ولدارا کھاڑے میں

بچپن اور لڑکپن میں مجھے کشتی اور لکڑی کے فن سے دلچسپی اس لئے ہوئی کہ میرے دو حقیقی چچا اور کئی چچازاد بھائی ان میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کی لٹھ بازی اور کشتی کے کئی مقابلے اور مظاہرے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ انہیں کی ہمت افزائی سے مجھ میں بھی کشتی اور لکڑی کا شوق پیدا ہوا۔ مڈل اسکول میں حساب کے استاد منشی چھب لال سنگھ کو ورزش اور کشتی سے خاص لگاؤ تھا، انہوں نے اسکول کے احاطے میں ایک اکھاڑا ابھار رکھا تھا اور صبح تڑکے اٹھ کر ڈنڈ بیٹھک شروع کر دیتے تھے۔ ہاسٹل کے ہندو طلبہ کو بھی انھوں نے ورزش کا عادی بنا دیا تھا۔ میں بھی ہاسٹل میں رہتا تھا اس لئے میں نے بھی وہاں کے ماحول کا اثر قبول کیا۔ چنانچہ ہم جماعتوں کے ساتھ زور آزمائی ہو جاتی تھی۔

منشی چھب لال سنگھ کشتی کے دنگلوں میں بھی اپنے شاگردوں کو لے جاتے تھے۔ ایک دنگل میں میرا مقابلہ انھوں نے ایک کڑی ذات کے ہندو جاٹ سے کرا دیا جاٹ سے پنجہ ملانے کے ساتھ ہی میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ طاقت میں کسی طرح مجھ سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہے۔ اس لئے طاقت کی بجائے داؤ پیچ ہی سے کام چل سکتا ہے لیکن داؤ لگانا بھی آسان نہ تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھ میں پوری قوت کے ساتھ پنجے دے رکھے تھے اور پیشانی ملا رکھی تھی

میری کوشش یہ تھی کہ جاٹ ذرا ڈھیلا پڑے تو میں گردن جھکا کر اس کی ٹھوڑی پر حملہ کر دوں لیکن شاید وہ بھی اسی تاک میں تھا۔ اس لئے ایسا کرنے کا موقع نہ ملا۔ ہم دونوں پندرہ بیس منٹ تک اتنی قوت اور شدت سے ایک دوسرے کی پیشانی رگڑتے رہے کہ خون بہہ نکلا آخر کار ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر کے ہمارا مقابلہ برابر قرار دے دیا گیا۔ گویا جان بچی لاکھوں پائے۔

یہ باتیں تیرہ چودہ سال کی عمر کی ہیں میرا خیال ہے اس کے بعد بچپن اور لڑکپن دونوں کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے اور آدمی جوانی یا نوجوانی کی حدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس لئے بات کو آگے بڑھانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

(نوٹ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے دو جداگانہ مضامین پیوست کر کے، بچپن کے یہ خود نوشت حالات مرتب کئے گئے۔ ضمنی سرخیاں البتہ میری ہیں۔) (ن۔ر)

⑤ تعلیم و تعلّم

ڈاکٹر فرمان فتح پوری زیرِ تحریر آپ بیتی میں لکھتے ہیں (ضمنی سرخیاں ڈاکٹر صاحب کی ہیں)

غیر رسمی تعلیم

"ہمارے گاؤں میں ایک چھوٹا سا مدرسہ تھا یہ چندے سے چلتا تھا۔ مولوی عزیز حیدر صاحب اس کے نگران تھے۔ خاندان کے سارے بچے اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم کے لئے عزیز حیدر صاحب کے حوالے کیے جاتے تھے۔ غالباً ان کو نقد تنخواہ بہت کم ملتی تھی۔ باری باری ہر گھر سے روز کا کھانا ضرور انہیں بھجوایا جاتا تھا۔ عید، بقرعید اور دوسری خوشیوں کے موقع پر انہیں دوسرے انعام و اکرام کے ساتھ نئے کپڑے بھی مل جاتے تھے، میرے سارے عزیزوں کی ابتدائی تعلیم انہیں کی نگرانی میں ہوئی، کریما، دستور الصبیان، ساماقیماں، بغدادی قاعدہ اور ناظرہ قرآن خاندان کے بیشتر بچوں نے انہی سے پڑھا۔

جیسا کہ میں نے اپنے بچپن کی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ میرا معاملہ دوسروں سے مختلف تھا۔ اباجی ملازمت سے سبکدوش ہوکر آئے تھے اور ٹھاٹ کی زندگی بسر کرتے تھے میں بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹا تھا اس لئے ابا اماں کا چہیتا تھا۔ جب تک اباجی حیات رہے میں زیادہ تر انہی کے ساتھ رہا۔ انھوں نے مجھے پہلے فارسی کا مصدر نامہ یاد کرایا، پھر کریما رٹوایا، پھر گلستان کی کچھ کہانیاں پڑھائیں، پھر اردو سے زیادہ فارسی کے اشعار یاد کرائے گئے۔ ناظرہ قرآن شریف کے لئے بھی انہوں نے مجھے عزیز حیدر کے مدرسے میں نہیں بھیجا بلکہ فرمان علی کی والدہ کے یعنی چچی کے حوالے کیا۔ وہ اردو لکھنے پڑھنے پر بھی پوری قدرت رکھتی تھیں اور قرآن شریف تو گویا ان کو ازبر

تھا۔ ناظرہ خوانی میں نے انھیں کی نگرانی میں ختم کی۔ پھر حفظ قرآن کا سلسلہ شروع کرایا، کئی پارے حفظ کر لئے تھے لیکن حالات نے یک بیک پلٹا کھایا، میری عمر سات اور آٹھ کے درمیان تھی والد صاحب کا دفعتاً انتقال ہوگیا اور میرے گھر کے حالات بالکل الٹ پلٹ گئے مجھے سمجھایا گیا کہ یہ عربی، فارسی کا سلسلہ ختم کرو اور کسی سرکاری سکول میں داخلہ لو تا کہ تعلیم کا کوئی دنیاوی حاصل نظر آسکے۔ چنانچہ یہی ہوا۔

غیر رسمی تعلیم کا ایک اور سلسلہ

پرائمری اور مڈل اسکولوں میں مسلمانوں کے ساتھ کئی ہندو بھی میرے استاد رہے۔ پرائمری میں شیو سنگل سنگھ کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ مڈل سکول کے سلسلے میں منشی دیبی دیال اور چھپ لال سنگھ کا تذکرہ بھی آچکا ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور ہندو بزرگ تھے جن سے مجھے بہت کچھ سیکھنے خصوصاً تلسی داس کی رامائن پڑھنے کا موقع ملا اور شعری اور افسانوی ادب کے حوالے سے یہ کتاب میری نہایت پسندیدہ کتابوں میں ایک ٹھہری چنانچہ آج بھی اس کا ایک اچھا نسخہ میرے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

یہ ہندو بزرگ جنھوں نے مجھے رامائن کے ساتھ ساتھ اور بہت کچھ پڑھایا پنڈت مہابیر پرشاد تھے، گاؤں کے قریب لیکن آبادی سے الگ ایک کٹی میں رہتے تھے جوگیوں جیسے گیروے کپڑے پہنتے تھے۔ لمبے قد اور سانولے رنگ کے آدمی تھے۔ عرفِ عام میں برہم چاری جی کہلاتے تھے، صاف ستھرے رہتے تھے اور عموماً صوفیوں جیسی پیار بھری باتیں کرتے تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ ہندو دھرم کے علاوہ عیسائیت اور اسلام سے بھی یک گونہ دلچسپی رکھتے تھے۔ انہیں قرآن کی کئی آیات اور چھوٹی چھوٹی سورۃ مع ترجمہ و مفہوم ازبر تھیں۔ اور وہ ہمیں بھی رامائن اشلوک اور کبھی قرآنی آیات سنایا کرتے تھے اور ان کا مفہوم بھی سمجھاتے تھے۔ ان کی شخصیت بھی

پرکشش تھی اور باتیں بھی بہت پرکشش انداز میں کرتے تھے نتیجتاً میں انھیں قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضری دیتا رہتا تھا۔

میرا گاؤں دریائے گنگا سے بہت قریب تھا تقریباً ایک میل کے فاصلے پر۔ پنڈت جی بھی قریب ہی رہتے تھے اور روزانہ صبح سویرے گنگا اشنان کے لئے جاتے تھے سورج نکلنے سے پہلے اشنان کر لیتے تھے، ان کا اشنان یا نہانا زیادہ تر اشلوک پڑھتے ہوئے اور "اوم اوم ہری ہری" کرتے ہوئے، بدن پر چلو میں پانی لے کر ادھر ادھر چھڑک لینے تک محدود ہوتا تھا، دھوتی کو البتہ جسے وہ آدھی کمر میں باندھے رہتے تھے اور آدھی گردن پر ڈالے رہتے تھے پانی میں ڈال کر نچوڑ لیتے تھے اور دوسری دھوتی پہن لیتے تھے۔ سردی، گرمی، برسات ہر موسم میں ان کا یہی معمول تھا۔ منہ اندھیرے اٹھتے تھے اور گنگا کی طرف چل دیتے تھے۔ ان کے ساتھ رہ کر مجھے بھی تڑکے اٹھ جانے کی عادت ہوگئی۔

پنڈت جی کے کردار اور گفتار میں خاص بات یہ تھی کہ وہ طبقاتی یا فرقہ وارانہ مسئلے پر بات نہ کرتے تھے، رشی منی یا سادھو اور صوفی کی طرح صرف بھلی باتیں ہی بتاتے تھے، اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ حضرت امیر خسرو کی خالق باری کے کچھ اجزا انہیں ازبر تھے اور وہ انہیں کی مدد سے اللہ اور بعض دوسرے ناموں کے مترادفات سمجھاتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی ہماری سمجھ کا امتحان لینے کے لیے سوالات کرتے تھے، ایک دفعہ کہنے لگے یہ بتاؤ کہ "ایشور دیالو ہیں یا نیائی ہے؟" یعنی خدا رحم دل ہے یا منصف ہے۔

ہم نے کہا وہ رحیم بھی ہے اور منصف بھی ہے۔ کہنے لگے جو رحم دل یا رحیم ہو وہ انصاف کیسے کرے گا؟ اس کے سامنے ملزم یا ملزم کا کوئی عزیز روئے گا گڑگڑائے گا اور مصیبتوں کا ذکر کرے گا تو رحم کا تقاضا یہ ہوگا وہ اسے معاف کر دے۔ اس بات کو انہوں نے مختلف مثالوں سے

ہمارے ذہن نشین کرایا اور ہم لاجواب ہوگئے۔ کئی دن سوچتے اور دوسروں سے پوچھتے رہے، کوئی ہمیں مطمئن نہ کر سکا، آخر کار انہوں نے ہمیں بہت کم عمری میں یہ بات ذہن نشین کرائی کہ بندے کے ایسے قصور جن کا تعلق براہ راست اللہ سے ہو اللہ انہیں ہر وقت معاف کر سکتا ہے اور کرتا ہے کہ وہ رحیم ہے لیکن جن باتوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے وہ انہیں ہرگز معاف نہ کرے گا اس لئے کہ وہ عادل اور منصف ہے۔ یہ بات ہمیشہ کیلئے سمجھ میں آگئی اور بڑا دل خوش ہوا۔

ایک اور واقعہ، پنڈت جی کے حوالے سے اکثر یاد آتا ہے۔ صبح سویرے کشتی میں سوار ہو کر، دریا کی سیر کو نکلے، ساحل کے دونوں طرف شادابی تھی چھوٹے پودوں کے ساتھ بڑے درخت بھی تھے کچھ پھولدار اور کچھ بغیر پھول کے، مچھلیوں، مینڈکوں اور کچھوؤں کی ڈبکیاں۔ ایک طرف طرح طرح کے پرندوں کی چہکار دوسری طرف سورج نکل رہا تھا اور اس کا عکس گنگا کے پانی میں ایک نیا سماں پیدا کر رہا تھا سبھی لوگ قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے میں محو تھے لیکن پنڈت جی، تھوڑی دیر بعد کشتی کے نچلے تختوں کو جھک جھک کر غور سے دیکھتے، پھر ہم لوگوں کے ساتھ مناظر پر تبصرہ کرنے لگتے، آخر کار میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کشتی کے اندر بار بار کیوں جھانکتے ہیں؟ کہنے لگے، ہمارا، تمہارا جیون بھی ایک طرح کی ناؤ ہے چل رہی ہے۔ کسی دن ڈوب جائے گی۔ ناؤ اس وقت ڈوبتی ہے جب اس میں کسی طرف سے پانی داخل ہو جائے اور کشتی کھینچنے والوں کو خبر نہ ہو۔ یقیناً دنیا کے سارے مناظر لطف اٹھانے کے لئے ہیں، ہر منظر اور ہر چیز سے لطف اندوز ہونا چاہیے بقول غالب:

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

لیکن لطف اندوزی میں اتنا کھو جانا کہ کشتی کی خبر نہ رہے، نادانی ہے۔ انسان کو چاہیے

کہ ہر چیز کو اپنے قابو میں رکھے یعنی جب چاہے اسے اختیار کرے اور جب چاہے اسے ترک کر دے۔ ہماری سمجھ میں ان کا فلسفہ پوری طرح نہ آیا تو انہوں نے مثال دے کر سمجھایا "فرض کیجئے آپ کو فٹ بال کھیلنے کا بڑا شوق ہے یہ بہت اچھی بات ہے لیکن شوق کو اپنے اوپر اس قدر طاری نہ کیجئے کہ فٹ بال آپ کے قابو میں نہ رہے بلکہ آپ فٹ بال کے قابو میں چلے جائیں۔ کامیاب زندگی کے لئے اعتدال بہت ضروری ہے ہر چیز اعتدال پر برقرار ہے اپنی حد سے آگے بڑھنے میں ہر چیز خراب اور تباہ ہو جاتی ہے"۔ پنڈت جی کا بتایا ہوا یہ فلسفہ میرے ذہن میں ایسا بیٹھا کہ ہمیشہ اس پر عمل کیا اور کار آخر یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ یہی تو اسلامی تعلیم کا تجزیہ ہے۔

رسمی تعلیم

ابا جی کی وفات کے بعد پرائمری اسکول میں داخل ہوا اور وہ بھی ہیڈ ماسٹر مولوی عبدالرشید کی حوصلہ افزائی کی بنا پر کہ وہ میرے قریبی عزیزوں میں تھے۔ میں تیسری جماعت میں تھا کہ رشید صاحب کا تبادلہ ہو گیا اور ان کی جگہ حبیب اللہ صاحب آ گئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے علاوہ دو استاد اور بھی تھے، ایک شیو سنگل سنگھ دوسرے مولوی عبدالمجید۔

شیو سنگل سنگھ جٹا دھاری سادھو کے روپ میں رہتے تھے۔ یعنی داڑھی کے ساتھ ساتھ ان کے سر پر لمبے بال بھی تھے جنہیں لپیٹ کر وہ سر کے اوپر چوٹی بنا کر باندھ لیتے تھے جنیو مستقل پہنتے تھے۔ قریبی کنوئیں کی جگت پر روز اشنان کرتے تھے اور کچھ اشلوک پڑھتے جاتے تھے۔ ان کا لباس چار پانچ گز کی ایک دھوتی تک محدود تھا جس کا ایک بڑا حصہ ان کی کمر میں اور کچھ حصہ ان کی گردن میں پڑا رہتا تھا۔ میں نے ان کے بدن پر کبھی کوئی دوسرا لباس نہیں دیکھا، زیادہ تر ننگے پاؤں رہتے تھے، باہر جانا ہوا تو کھڑاؤں پہن لیتے تھے۔ چھوت چھات میں کٹر اور مزاج کے بھی ترش تھے لیکن پڑھانے میں بڑی محنت کرتے تھے اور کسی قسم کے تعصب کا شکار نہ تھے۔

مولوی عبدالحمید صاحب نئے نئے نارمل کی ٹریننگ کر کے آئے تھے۔ نستعلیق قسم کے آدمی تھے، کرتا یا قمیص، علیگڑھ طرز کا پاجامہ اور شیروانی پہنتے تھے نہایت شائستہ وذمہ دار استاد تھے اور طلبہ کے ساتھ ساتھ ان کے سرپرستوں میں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

اس وقت یو پی میں، پرائمری اسکول درجہ چہارم تک ہوتے تھے اور فائنل کا امتحان ڈسٹرکٹ بورڈ کے تحت، تحصیلی مرکزوں میں، ڈپٹی انسپکٹران کی نگرانی میں لیا جاتا تھا۔ مختلف اسکولوں کے اساتذہ پرچے بناتے تھے اور کاپیاں جانچتے تھے۔ چوتھی جماعت میں جو لوگ میرے ساتھ تھے ان میں بھگوتی پرشاد، مہادیو، ہارون احمد، سید زاہد علی، ضیاء الحسن، سید فرمان علی کے نام مجھے یاد ہیں۔ ہارون احمد صاحب کیبنٹ ڈویژن اسلام آباد میں ڈپٹی سیکرٹری کے عہدے تک پہنچنے کے بعد سبکدوش ہو چکے ہیں اور میرے بے تکلف دوستوں میں ہیں۔

ریاضی کا مضمون شروع ہی سے میرا پسندیدہ مضمون تھا اور سخت سے سخت امتحان میں بھی میرے سو فیصد نمبر آتے تھے نتیجتاً ہر امتحان میں میری پوزیشن اول رہتی تھی۔ پرائمری کا فائنل امتحان منعقد ہوا، اسکول سے تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر امتحانی مرکز تھا۔ اس میں میرے ساتھ ہارون احمد، سید فرمان علی بھی شریک ہوئے تھے لیکن کامیاب صرف میں ہوا اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔

ہمارے علاقے میں ایک مسلمان طالب علم چونکہ ایک مدت کے بعد اس طرح کے امتحانات میں اول آیا تھا اس لئے میری کامیابی کا جشن جگہ جگہ اس طرح منایا گیا جیسے میں کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔

مڈل اسکول میں داخلہ

پرائمری پاس کرکے میں مڈل اسکول میں داخل ہوا۔ مڈل اسکول میرے گھر سے چھ میل کے فاصلے پر ایرایاں نامی قصبے میں تھا۔ ننھیال ہونے کے علاوہ ایرایاں میں، میری گھر گھر رشتہ داریاں تھیں۔ لیکن میں نے باوجود اسکول کے ہاسٹل میں رہنا پسند کیا۔ قصبے کی آبادی پانچ ہزار افراد پر مشتمل تھی اکثریت مسلمانوں کی تھی اسکول کی پوری عمارت کچی تھی، کمرے صرف دو تھے اس میں ہیڈ ماسٹر صاحب کا دفتر بھی تھا اور ساتویں یعنی مڈل فائنل کی کلاس بھی ہوتی تھی۔ دوسرے کمرے میں ہاسٹل انچارج رہتے تھے۔ باقی دو دالانوں میں پانچویں اور چھٹی کی کلاسیں لگتیں تھیں۔ ہاسٹل صرف کچے کمروں پر مشتمل تھا دو ہندو طلبہ کیلئے تھے اور ایک مسلمان طلبہ کیلئے الگ دو باورچی خانے ان کے علاوہ ایک میں مسلمان اور دوسرے میں ہندو طلبا اپنا کھانا پکاتے تھے۔ اور ایسی چہل پہل اور خوش دلی کے ساتھ رہتے تھے جیسے وہ کسی محل میں رہ رہے ہوں۔ حالانکہ طلبہ کے اپنے مکانات یا رہائشیں اسکول کی عمارت سے   بہتر تھیں لیکن اسکول کے خوشگوار ماحول نے اس کچے گھروندے کو ہم سب کے لئے بہت خوشگوار بنا دیا تھا۔

اسکول قصبے کی آبادی سے ملحق تھا۔ البتہ اس کے تین طرف کھیت، میدان، باغات اور تالاب واقع تھے اس لئے فضا بہت کشادہ محسوس ہوتی تھی۔ ہاسٹل کے انچارج منشی چھب لال سنگھ ذات کے ٹھاکر تھے۔ الگ ایک چھوٹے کمرے میں رہائش تھی لیکن وہ اپنا زیادہ وقت کمرے سے باہر ہی گزارتے تھے۔ کھانا ہندو طلبہ کے ساتھ انہیں کی رسوئی اور چوکے میں کھاتے تھے۔ چھوت چھات کے سختی سے قائل تھے۔ عموماً دیاشنکر اور رماشنکر جو میرے کلاس فیلو تھے منشی جی کا کھانا پکاتے تھے یہ دونوں طالب علم برہمن زادے تھے۔ ظاہر ہے مسلمانوں یا ان کے لفظوں میں ترکوں کا سایہ تک اپنے کھانے پر نہ پڑنے دیتے تھے، پھر بھی مسلمان طلبہ کبھی کبھی شرارتاً ان کی رسوئی یا چوکے کو

چھو کر اپنے لئے ان کا کھانا حاصل کر لیتے تھے کہ یہ ان کے لئے بیکار ہو جاتا تھا۔ منشی چھب لال سنگھ پڑھانے میں بھی سخت گیر تھے اور انتظامی امور میں بھی۔ کسرتی جسم کے بھاری بھرکم آدمی تھے۔ تڑکے اٹھ کر ڈنڈ پیلتے تھے اور طلبہ کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے، چنانچہ ہاسٹل کے سارے ہی طلبہ کشتی کے فن میں ان کے شاگرد ہو گئے تھے اور صبح کو ایک گھنٹہ ان کے ساتھ اکھاڑے میں گزارتے تھے۔ مسلمان طالب علموں میں فرمان علی اور میں نے ہندو طلبہ میں دیاشنکر، رماشنکر، رامیشور نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور ان کی ترغیب و حوصلہ افزائی کے نتیجے میں علاقے کے اور اسکولوں کے مقابلوں میں کشتیاں لڑیں اور انعامات بھی حاصل کئے۔

مسلم ہائی اسکول فتح پور

مڈل اسکول کا فائنل امتحان میں نے درجہ اول میں پاس کیا اور ضلع میں اول آیا۔ ہمارے اسکول کو برسوں کے بعد اس طرح امتیازی حیثیت حاصل ہوئی تھی اس لئے خوب جشن منایا گیا اور ایک اچھے طالب علم کی حیثیت سے پورے ضلع میں میرا نام ممتاز ہو گیا۔ شہر میں اس وقت تین ہائی اسکول تھے اور ان میں سے ہر ایک بہت سی رعایتوں کے ساتھ مجھے داخلہ دینے پر آمادہ تھا۔ لیکن میں نے مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں، جس کی انگریزی شاخ کا نام مسلم ہائی اسکول تھا داخلہ لیا کئی عزیز اور قصبے کے لڑکے بھی اس میں داخل   تھے کہ یہاں انہیں نسبتاً آسانی سے داخلہ مل جاتا تھا۔ میں نے فتح پور خاص میں تقریباً دس سال رہ کر کیا کچھ کیا اور اس شہر کے علمی و ادبی ماحول نے مجھے کیا کچھ دیا، اس کا ذکر قدرے تفصیل چاہتا ہے البتہ یہاں صرف مسلم ہائی اسکول کے تعلیمی ماحول کا مختصر ذکر ضروری معلوم ہوتا۔

فتح پور کا مسلم ہائی اسکول جو بعد کو انٹر کالج بن گیا، اسی طرح کا مسلم ہائی اسکول تھا، جس کی مثالیں، اس وقت بھی برصغیر پاک و ہند کے ہر ضلعی مرکز اور شہر میں موجود تھیں اور آج بھی

موجود ہیں، یہ اسکول سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک کے زیر اثر قائم کئے گئے تھے اور ان کا نظم و نسق وہاں کے مسلمان رجسٹرڈ انجمنوں کے تحت چلاتے تھے، گورنمنٹ بھی سالانہ امداد دیتی تھی لیکن ان کی ترقی اور کارکردگی کا انحصار عملاً عوامی چندے اور مخیر حضرات کی خصوصی عطیات پر تھا، کانپور، الہ آباد، اٹاوہ اور دوسرے شہروں کے مسلم اسکول اسی نہج پر چل رہے تھے اور اس میں شک نہیں کہ بحسن وخوبی چل رہے تھے۔ لیکن مسلم ہائی اسکول فتح کے قیام اور اس کی توسیع کا پس منظر دوسرے شہر کے مسلم ہائی اسکولوں سے ذرا مختلف ہے۔

یہ اسکول ابتدا ایک عربی مدرسے کے طور پر ۱۸۸۲ء بمطابق ۱۳۰۱ھ میں قائم ہوا تھا۔ اس کے بانی، اپنے وقت کے ایک بہت بڑے عالم و مصلح مولانا سید ظہور الاسلام تھے، اس میں حفظ قرآن اور درس نظامیہ کا انتظام، چند برسوں کے اندر ہی قائم ہو گیا پھر مولانا کی کوششوں سے اس میں انگریزی تعلیم کا آغاز کر دیا گیا اور انیسویں صدی کے آغاز سے قبل ہی اس کے درجات میٹرک کی منزل تک پہنچ گئے۔ اس طرح مدرسے کی دو مستقل شاخیں ہو گئیں، اسلامیہ شاخ اور انگریزی شاخ بہت عرصے تک دونوں کا انتظام، ایک مجلس نظما کے سپرد رہا پھر بوجوہ دونوں کے انتظامیہ یونٹ الگ الگ ہو گئے۔

مدرسے کی دونوں شاخیں، ایک احاطے میں ایک ہی عمارت کے اندر قائم تھیں اور اپنے تعلیمی نتائج، حسن انتظام کیلئے خاص شہرت رکھتی تھیں۔ مدرسہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند سے باقاعدہ منسلک تھا اور اس میں درس نظامیہ کی تکمیل کا معقول انتظام تھا، مسلم ہائی اسکول، (انگریزی شاخ) انٹرمیڈیٹ بورڈ یوپی الٰہ آباد سے منظور شدہ تھا لیکن کئی اساتذہ ایسے تھے جو دونوں شاخوں میں پڑھاتے تھے۔ طلبا بھی آزاد تھے، کبھی وہ عربی شاخ میں بیٹھنے لگتے تھے کبھی انگریزی شاخ میں۔ دونوں کی کلاسیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی لگتی تھیں فرق یہ تھا کہ انگریزی

پڑھنے والے کرسیوں پر بیٹھتے تھے اور درس نظامیہ والے دریوں پر لیکن دونوں میں کسی طرح منافرت نہ تھی۔ ایک ہی عمارت ایک ہی احاطہ، ایک ہی مسجد، ایک ہی کھیل کا میدان، ایک ہی ہاسٹل، ایک ہی طرح کا ماحول، عجب لطف رہتا تھا، انگریزی پڑھنے والے اپنے ذوق وشوق کے مطابق وقت نکال کر درس نظامیہ میں شامل ہو جاتے تھے اور درس نظامیہ والے انگریزی سے مستفید ہوتے تھے میں نے بھی اس سہولت سے فائدہ اٹھایا لیکن درس نظامیہ کو جلد چھوڑ کر معاشی ضرورتوں کے تحت انگریزی شاخ کو اپنا لیا۔

اس مدرسے اور اس کے بانی مولانا سید ظہور الاسلام کا تفصیلی ذکر میں نے ایک الگ مضمون میں کیا ہے۔ یہ میری کتاب "نیاز فتح پوری دیدہ وشنیدہ" میں شامل ہے۔ مولانا حسرت موہانی اور علامہ نیاز فتح پوری نے بھی مدرسہ اور بانی مدرسہ دونوں کا ذکر نہایت عقیدت و احترام سے کیا ہے۔ اس مدرسے کے تعلیم یافتہ حضرات میں بیشتر نے زندگی کے مختلف شعبوں میں نام پیدا کیا لیکن علم وادب کے حوالے سے جن لوگوں نے خاص شہرت حاصل کی ان میں مولانا بدیع الزمان خان، مولانا حسن الدین خاموش، مولانا عبدالرزاق کانپوری، مولانا حسرت موہانی، علامہ نیاز فتح پوری کے نام آتے ہیں۔ اس مدرسے میں طالب علم اور معلم کی حیثیت سے میں دس سال رہا اور یہ دس سال کا عرصہ میری زندگی کا ناقابل فراموش اور بہت ہی قیمتی حصہ ہے۔

حلیم مسلم انٹر کالج

۱۹۳۶ء کی بات ہے کہ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد، میں نے حلیم انٹر کالج کانپور میں داخلہ لیا کہ فتح پور سے یہ بہت قریب تھا چنانچہ فتح پور کے بیشتر مسلمان طلبہ میٹرک کے بعد اسی کالج میں داخلہ لیتے تھے۔ میرے بڑے بھائی اور کئی دوسرے عزیز بسلسلۂ ملازمت کانپور ہی میں مقیم تھے۔ میرے دوستوں کا ایک حلقہ بھی وہاں موجود تھا۔ اس حلقے میں مجھ سے قدرے سینئر

ایک دوست جناب رحمت اللہ خصوصاً میرے داخلے کے سلسلے میں پیش پیش تھے۔ میں نے تین مضامین میں امتیازی نمبروں کے ساتھ درجہ اوّل میں میٹرک کیا تھا، اس لئے داخلے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ پرنسپل عبدالشکور صاحب کے سامنے گیا انھوں نے مجھے شاباش کہتے ہوئے اور بعض دوسری رعایتیں دینے کا وعدہ کرتے ہوئے داخلہ دے دیا۔

میں نے انٹر سال اوّل کے لئے جو مضامین انتخاب کئے ان میں تاریخ، ریاضی اور فارسی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر طاہر صاحب ریاضی کے استاد تھے، اویس احمد ادیب صاحب اردو پڑھاتے تھے، پروفیسر فضل الرحمن صاحب غالباً انگریزی پڑھاتے تھے اور ایسے انداز سے پڑھاتے تھے کہ میں ان سے خاصا متاثر تھا۔ میری سیٹ کے برابر والی سیٹوں پر جو لوگ بیٹھتے تھے ان میں جسارت اخبار کے پبلشر جناب سید ذاکر علی صاحب اور فتح پور میں میٹرک کے میرے ہم جماعت محمد صدیق خان صاحب (مقیم کراچی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حلیم مسلم کالج کانپور کی تعلیمی و تدریسی فضا سے زیادہ اس کا شعری و ادبی ماحول خاص شہرت رکھتا تھا۔ آئے دن مشاعرے اور ادبی جلسے ہوتے رہتے تھے اور مجھ جیسے طالب علموں کے ادبی ذوق و شوق کو سنوارنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتے تھے گویا حلیم مسلم کالج کی ادبی فضا مسلم انٹر کالج کی فضا سے بہت ملتی جلتی تھی لیکن میرے معاشی حالات کچھ اس طرح کے تھے کہ میں بقدر شوق اس سے مستفیض نہ ہو سکا، میرے بڑے بھائی کانپور میں ہی تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ میں باقاعدہ تعلیم جاری رکھوں لیکن جب میں یہ دیکھتا تھا کہ گھر کے خرچے کا پورا بوجھ ان کے کاندھوں پر ہے اور میری باقاعدہ تعلیم ان پر مزید بوجھ ڈالے گی تو ٹھٹک جاتا تھا نتیجتاً تین چار مہینے کے بعد میں نے کالج جانا چھوڑ دیا۔

چھوڑی ہوئی ملازمت کی فکر ہوئی لیکن تعلیم جاری رکھنے کا طبعی شوق کچھ کرنے نہ دیتا تھا

چاہتا یہ تھا کہ ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی طرح قائم رہے لیکن یوپی کے انٹرمیڈیٹ بورڈ یا کسی یونیورسٹی سے سارے مضامین کے ساتھ پرائیوٹ امتحان دینے کی اجازت اس وقت نہ تھی۔ اس وقت اس کی دو ہی صورتیں تھیں ایک یہ کہ صرف انگریزی میں انٹر اور بی اے کر لیا جائے لیکن یہ وسیلہ میرے مزاج کے مطابق نہ تھا اول اس لئے کہ ایسا کرنے والوں میں مجھے شاذ ہی قابل ذکر انٹر یا گریجویٹ نظر آتے تھے دوسرے یہ کہ جب انہیں "طرا" "وایا بھٹنڈا" کہا جاتا تھا تو اس وسیلہ تعلیم کو اپنانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ یوپی بورڈ سے سارے مضامین کے ساتھ انٹر کا پرائیوٹ امتحان دیا جائے لیکن صرف وہی لوگ پرائیوٹ امتحان دے سکتے تھے جو یوپی بورڈ الہ آباد سے باقاعدہ منسلک کسی ہائی اسکول ٹیچر ہوں اور جو اپنا امتحانی فارم پرنسپل یا ہیڈ ماسٹر کی تصدیق کے ساتھ بورڈ کو بھجوا سکتے ہوں۔ یہ ایک بڑی کٹھن شرط تھی اس لئے کہ منظور شدہ ہائی اسکولوں میں اس وقت ٹیچر ہو جانا آسان نہ تھا لیکن اس مشکل وقت میں میرا شہر اور میرا پرانا ہائی اسکول میرے کام آیا اور مسلم ہائی اسکول فتح پور کی مجلس نظما کے سیکرٹری جناب سید اولاد حسین اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر استاذی جناب محمد اسحاق صدیقی کی توجہ سے میں نے جس اسکول میں پڑھا تھا اسی میں پڑھانے لگا۔ چالیس روپے ماہوار تنخواہ بھی ملنے لگی اور تعلیم جاری رکھنے کی صورت بھی نکل آئی۔

مسلم ہائی اسکول فتح پور میں آٹھویں، نویں اور دسویں جماعتوں کو ریاضی اور انگریزی پڑھاتا تھا۔ اور انٹر کے امتحان کی تیاری بھی کر رہا تھا، گاہے گاہے کانپور بھی چلا جاتا تھا وہاں کے دوستوں سے کالج کے اساتذہ کے لکھائے ہوئے نوٹس وغیرہ لے آتا تھا لیکن زیادہ تیاری تن تنہا اپنے طور کرنی پڑتی تھی عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم اور مڈل اسکول اور ہائی اسکول کا نصاب اور اس میں میری مہارت، کامیابی، انٹر میں بھی میرے کام آئی۔ انگریزی اور ریاضی کے سوا مجھے کسی مضمون

میں کوئی خاص محنت نہیں کرنی پڑی۔ ریاضی میں میرے سینئر دوست جناب مسعود اختر صاحب پوری توجہ سے میری رہنمائی کرتے رہے اور میں نے ہر طرح اپنی تیاری مکمل کر لی۔ لیکن امتحانی فارم میں نجانے کیسی غلطی ہوگئی کہ مجھے اچانک ریاضی کی بجائے یورپین ہسٹری کے مضمون میں امتحان دینا پڑا۔ اس صورتِ حال سے میری کامیابی مشکوک ہوگئی تھی لیکن سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہوگیا خدا کا شکر ادا کیا اور بہت خوش ہوا کہ بورڈ کے سالانہ امتحان کے نتائج کے سلسلے کا جو گزٹ شائع ہوا اس میں کالج میں باقاعدہ پڑھنے والے دوستوں کے ساتھ میرا نام اور رول نمبر بھی شامل تھا۔

کرائسٹ چرچ کالج کانپور

انٹر پاس کرنے کے بعد پھر وہی سوالات پیدا ہوئے بی اے میں داخلہ لیا جائے کہ نہ لیا جائے۔ ذاتی ذوق و شوق کا پہلا تقاضا یہی تھا کہ داخلہ لیا جائے اور کرائسٹ چرچ کالج کانپور میں لیا جائے کہ وہ ان دنوں خاص شہرت رکھتا تھا اور میرے بیشتر عزیز و احباب بھی اسی کے طالبعلم تھے لیکن گھر کے حالات کا مطالبہ کچھ اور تھا کوئی ملازمت کوئی ذریعہ معاش بڑے بھائی کا سہارا بن جانے کی کوئی جتن، کسی طرح کچھ کمانے کی کوشش وغیرہ وغیرہ ایسا کرنا یوں بھی ضروری تھا کہ میٹرک کے ایک سال بعد میری شادی ہوگئی تھی اور اللہ نے انٹر پاس کرنے کے ساتھ ہی ہمیں ایک بیٹا بھی دے دیا تھا اب ہمارا ایک پورا خاندان تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔

اسی دوران میں یہ ہوا کہ میرے دوست شباہت علی خان کے چچا اعجاز علی خان کے لطف خاص سے پرشین گلف میں ہم دونوں کے لئے ملازمت کی صورت پیدا ہوگئی۔ ٹائپنگ سیکھی، کپڑے بنوائے اور بحری راستے سے بمبئی ہوتے گلف پہنچ گئے۔

وہاں کے ٹھاٹھ ہی کچھ اور تھے میری اور شباہت کی زندگی بنتی نظر آئی۔ چنانچہ وہ تو ادھر

ہی کے رہ گئے۔ آج کل مستقلاً قیام فرینکفرٹ (مغربی جرمنی) میں ہے۔ مجھے البتہ گردشِ زمانہ سے فرصت نہ ملی، والدہ صاحبہ پہلے بھی اتنی دور جانے کی اجازت نہ دے رہی تھیں، شادی کو مشکل سے ڈیڑھ سال گزرا تھا ، میری بیوی سلمیٰ بھی پریشان رہتی تھیں، تو مولود کی آمد ان کے لیے خوشی کا باعث تھی لیکن انہیں بھی میری دوری گوارا نہ تھی۔ ساتھ رہ کر دال دلیہ پر گزارا کرنے کو تیار تھیں۔ بڑے بھائی کی محبت یقیناً اتنی ارزاں تھی کہ وہ میرا اور میرے خاندان کا بوجھ اٹھانے کو تیار تھے لیکن میرا ان سے دور رہنا ان کے لیے تکلیف دہ تھا۔ ایسے میں میرا جی گلف گیا لگتا بہت تھوڑے عرصہ رہ کر واپس آ گیا۔

واپس آ کر جھٹ کانپور پہنچا کہ بڑے بھائی وہیں تھے اور کرائسٹ چرچ کالج میں داخلہ لے لیا۔ میرے پرانے دوست رحمت اللہ صاحب یہاں بھی میرے خاص معاون ثابت ہوئے۔ میری ان کی دوستی ادب اور ریاضی دونوں سے یکساں دلچسپی کے سبب تھی۔ وہ مجھے سیدھے ریاضی کے پروفیسر مسٹر سیٹھ کے پاس لے گئے۔ معمولی دھوتی اور کرتا پہنے بیٹھے تھے، ریاضی سے میری دلچسپی پر خوش بھی ہو رہے تھے اور نصیحت بھی کر رہے تھے کہ مسلمانوں میں دو چار طالب علم ہی اس طرف آتے تھے۔ کلاسیں شروع ہوگئیں۔ اردو، فارسی کے استاد پروفیسر سید نواب علی تھے۔ لیکن وائے گردشِ زمانہ میرا بیٹا ابرار سخت بیمار ہوگیا۔ علاج معالجے میں اخراجات اتنے بڑھے کہ ملازمت کو تعلیم پر ترجیح دینی پڑی پھر فتح پور واپس آ گیا اور خدا بھلا کرے استاد محمد اسحاق صدیقی پرنسپل مسلم ہائی اسکول کا کہ مجھے انہوں نے اسکول میں پھر ملازمت دے دی۔ پڑھانے میں ہمیشہ میں نے بڑی محنت کی اور اپنے طلبہ اور رفقاء سب کو یکساں خوش رکھا۔ ریاضی کے معلم کی حیثیت سے اسکول میں میری خاصی اہمیت تھی اور میرے گھر پر کئی طالب علم ٹیوشن پڑھنے آ جایا کرتے تھے۔ میری ماہانہ تنخواہ اب ساٹھ روپے ہوگئی تھی، تقریباً اتنے ہی ٹیوشن سے مل جاتے تھے۔ اچھی بسر ہو جاتی تھی۔ ویسے بھی اس زمانے میں ہائی اسکول کے اساتذہ معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور سرکاری حلقوں میں ان کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔

اب مجھے بی۔اے کرنے کی فکر ہوئی۔ اس وقت صرف آگرہ یونیورسٹی ہی پرائیویٹ بی۔اے کرنے کی اجازت دیتی تھی اور وہ بھی صرف ان لوگوں کو جو حکومت سے منظور شدہ کسی ہائی اسکول میں باقاعدہ ٹیچر ہوں اور ان کی درخواست پرنسپل کے توسط سے بھیجی گئی ہو۔ میرے پرنسپل صاحب کو خود بھی میری تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی۔ میں امتحان کی تیاری کر چکا تھا۔ گاہے گاہے کانپور چلا جاتا اور کالج کے دوستوں سے نوٹس حاصل کر لیتا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ اردو کے سوا باقی سارے مضامین بشمول فارسی، سوالوں کے جوابات انگریزی میں دینے ہوتے تھے پھر بھی میں نے انگریزی میں اتنی مشق و مہارت پیدا کر لی تھی کہ امتحان میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ اس وقت امتحان کے نتائج بہت سخت آتے تھے۔ چند فی صد طلبہ کامیاب ہوتے تھے۔ مارچ میں امتحان ہوا تھا۔ جون کے پہلے ہفتے میں نتیجے کا اعلان ہو گیا میں سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہوا۔ اللہ کا شکر ادا کیا۔

فتح پور شہر میں بحیثیت طالب علم اور بحیثیت اسکول ٹیچر میں دس سال کے قریب رہا۔ یہ دس سال وہاں کن مشاغل میں اور کس طرح گزارے (اس ضمن میں) صرف اس جگہ اتنا بتا دوں کہ میں نے مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے سلسلے میں بہت فعال کردار ادا کیا تھا۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے سارے رہنما مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ فتح پور میں بعض تحریکیں میں نے اس قسم کی شروع کر رکھی تھیں کہ ہندو زعماء مجھ سے ناراض تھے۔ چنانچہ قیام پاکستان کے فوراً بعد ان کا رویہ میرے ساتھ معاندانہ ہو گیا۔ پہلے مجھے قانون گوئی کے ٹریننگ کالج ہردوئی سے نکلوایا گیا پھر مجھے اسکول سے نکلوانے کی مہم چلائی گئی۔ اسد اللہ کاظمی صاحب کے بعد ایجوکیشنل سرکل انسپکٹر ہو کر چھتی لال صاحب آ گئے تھے۔ وہ میرے بعض مشاغل کی بنا پر میرے درپے ہو گئے اور اسکول کی انتظامیہ کو مجبور کیا کہ وہ مجھے سبکدوش کر دے پھر بھی انتظامیہ کے ارکان مجھ سے اتنی محبت کرتے تھے کہ مجھے بچانے کے لیے کسی نہ کسی بہانے سے انسپکٹر کے احکامات کو ٹال دیا کرتے تھے۔

آخر کار میں نے خود سوچا کہ اب یہاں میرا رہنا مناسب نہیں ہے۔ اسکول کے بزرگ

دوستوں اور منتظمین نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا سوال پیدا ہوا کہ کہاں جاؤں والدہ صاحبہ اسی سال ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئیں تھیں اور مجھے بے یار و مددگار چھوڑ گئی تھیں۔ بڑے بھائی کی محبت میرے حق میں اگرچہ مزید ارزاں ہو گئی تھی لیکن ان کے بھی کئی بچے تھے اور ان بچوں کی پرورش ان کے لئے آسان نہ تھی۔ میرا خاندان اب چار افراد پر مشتمل تھا۔ اس لیے کہ ابرار کی پیدائش کے دو سال بعد اللہ نے مجھے شمیم کے نام سے ایک بچی بھی دے دی تھی۔ میری عمر ابھی صرف تئیس (۲۳) سال تھی اور مجھے کسی بھی سرکاری محکمے میں آسانی سے ملازمت مل سکتی تھی لیکن ہندوستان کے حالات مسلمانوں کے حق میں ایسے خراب تھے کہ ملازمت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

پاکستان کا ارادہ کیا کہ اس کے قیام کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور اسی کی محبت میں کچھ کھویا تھا۔ صرف بڑے بھائی اور بیگم پر بہت رازداری سے اپنا ارادہ ظاہر کیا اس لیے کہ اس وقت ہندوستان سے پاکستان جانے کی خبر کرنا ایک طرح کا جرم تھا اور میرے حالات تو کچھ اس طرح کے تھے کہ میں خاموشی ہی سے پاکستان کا رخ کر سکتا تھا۔ میں ۱۹۴۸ء میں پرشین گلف جا چکا تھا۔ میرے پاس انٹرنیشنل پاسپورٹ موجود تھا اس لیے میں نے گلف کا ٹکٹ لیا اور مسقط کا مسافر بن کر بمبئی سے بحری جہاز پر سوار ہو گیا۔ جون ۱۹۵۰ء کا آخری ہفتہ تھا اور رمضان کا مہینہ اور ۲۶ واں روزہ کیماڑی کے پورٹ پر جہاز رکا تو عرشے سے ساحل پر نگاہ ڈالی۔ میرے عزیز اور ہمدم دیرینہ حبیب صدیقی نظر آئے قدرے اطمینان ہوا اور تین چار گھنٹے کی تگ و دو کے بعد میں جہاز سے نیچے آیا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔

اردو کالج میں داخلہ

کراچی پہنچ تو گیا لیکن پریشان کن حالات اور کس طرح کہاں کہاں اور دو تین سال تک کیا کرتا رہا یہ ایک لمبی داستان ہے۔ اس جگہ صرف اس قدر کہنا ہے کہ ہزار سختیوں اور پابندیوں

کے باوجود تعلیم کے شوق نے مجھے یہاں بھی بے چین رکھا۔ پہلے اردو کالج کے شعبہ انگریزی میں داخلہ لیا، اس وقت جلیل صاحب، واسطی صاحب اور افتخار صاحب وغیرہ، انگریزی کے اساتذہ تھے۔

انگریزی میں داخلہ لینے کا خاص سبب تھا۔ ۱۹۵۰ء سے علامہ نیاز فتح پوری کے مشہور زمانہ، ماہنامہ "نگار" میں میرے مضامین چھپنے لگے تھے اور مجھے یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی کہ میں اردو کا ادیب تو بن ہی گیا ہوں اب انگریزی میں ایم اے کی ڈگری اور مہارت حاصل کر کے اردو والوں پر اپنا رعب جمانا چاہیے لیکن بقول یگانہ:

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ آدمی کہ جسے بختِ نارسا نہ ملا

میرے حالات نے مجھے باقاعدہ تعلیم جاری رکھنے کی اجازت نہ دی اور میں کئی سال تک امتحان دینے کی ہمت نہ کر سکا۔ میں اپنے خاندان کا پہلا فرد تھا اور سب کو چھوڑ چھاڑ، زمینداری و مکان کو لات مار پاکستان چلا آیا تھا ظاہر ہے ہندوستان میں میرے بھائی بہن اور بیوی بہت پریشان تھی اور مجھے ایسے درد بھرے خط لکھتے تھے کہ دل امنڈ آتا تھا۔ چاہتا تو اردو میں آسانی سے ایم اے کر لیتا لیکن انگریزی کے شوق یا خبط نے مجھے پورے آٹھ سال اپنے ہم جماعتوں سے پیچھے دھکیل دیا اور ۱۹۵۸ء سے پہلے میں اردو میں ایم اے نہ کر سکا۔

ایس، ایم۔ لاء کالج کراچی

اس وقت ایل ایل بی کی کلاسیں صرف ایس ایم لاء کالج میں ہوتی تھیں۔ کالج شام کو لگتا تھا، حسن علی عبدالرحمن صاحب جو بعد کو حیدرآباد یونیورسٹی جام شورو کے وائس چانسلر رہے اس کالج کے پرنسپل تھے اور کریمنل لاء کا پرچہ پڑھاتے تھے۔ بیرسٹر منظور حسین اور طفیل علی عبدالرحمن بھی اس کالج کے مشہور استادوں میں سے تھے۔ مجھے ان تینوں کے لیکچر بہت پسند تھے اور میں ان

میں ضرور شرکت کرتا تھا۔ طفیل علی عبدالرحمن کا طرزِ تدریس ذہن میں خصوصاً اثر انداز ہوتا تھا اور ان کی شخصیت میں بھی انسان دوستی اور طلبہ ہمدردی سے قابل ذکر عناصر نظر آتے تھے۔ غرض یہ کہ میں دو سال اس کالج میں طالب علم رہا اور ۱۹۵۳ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔

تدریس کے سوا، کوئی ملازمت دل کو نہ لگتی تھی اس لیے وکالت کا خیال ذہن میں راسخ ہو گیا۔ باقاعدہ تیاری شروع کر دی اور جزوقتی طور پر کام بھی شروع کر دیا۔ علامہ نیاز فتح پوری کو اپنے نئے مشغلے کی اطلاع دی تو وہ جزوی طور پر میری خوشی میں شریک بھی ہوئے لیکن اپنے خط میں یہ بھی لکھا:

"آپ کی کامیابی سے مسرت ہوئی، گو وکالت کا تاریک پہلو سامنے رہتا ہے اور آخرکار احساسِ حسن ضعیف ہو جاتا ہے لیکن احساسِ حسن سے زیادہ احساسِ معاش ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ وکالت سے آپ کی معاشی دشواریاں کم ہو جائیں گی تو ضرور شروع کر دیجیے۔"

(مورخہ: ۱۹ جولائی ۱۹۵۴ء)

ایل ایل بی کرنے کے بعد جب وکالت کی طرف سے منہ موڑ لیا تو ایک بار پھر تعلیم کا شوق چرایا۔ کتنی بڑی غلطی تھی کہ اردو ایم اے کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ صرف اس غلط فہمی کے سبب کہ مجھے تو بہت اچھی اردو آتی ہے اور میں تو اردو کا جانا پہچانا ادیب بن گیا ہوں۔ یہی خیال تھا کہ جس نے تعلیم کے دوسرے شعبوں یا مضامین کی طرف مجھے راغب رکھا، چنانچہ اب میں نے بی ٹی کرنے کا ارادہ کر لیا۔

قیصر حسین بختیاری صاحب کی کوشش سے کراچی میں نیا نیا پہلا ٹریننگ کالج علی گڑھ کے طرز پر کھلا تھا۔ اردو کالج کے پاس مشن روڈ پر کلاسیں ہوتی تھیں۔ بی ٹی کی کلاسوں میں حاضری کی پابندی بہرحال کرنی پڑتی تھی اس لیے کہ اس کا تعلق عملی امتحان سے بھی ہوتا ہے لیکن میں چونکہ ملازمت بھی کرتا تھا اس لیے بہت مشکل سے حاضریاں پوری کرتا تھا۔ کالج کے اساتذہ میں اس

کے پرنسپل جناب مختیاری صاحب اور میرے دوست قدیم وقار زیدی صاحب اور خورشید زیدی صاحب مجھ پر بطور خاص مہربان تھے اور سچ یہ ہے کہ میں انہی حضرات کے لطفِ خاص کے سبب ٹریننگ کالج کی پابندیوں اور سختیوں کو بھی جھیل گیا اور ایل ایل بی کرنے کے دو سال بعد ۱۹۵۵ء میں ایل ایل بی کی طرح بی ٹی کی ڈگری بھی سیکنڈ ڈویژن میں حاصل کر لی۔ بی ٹی کالج کے ساتھیوں میں دبیر احمد صدیقی، محمود الحسن صدیقی، سید اعجاز حسین نقوی، مقبول حسین کاظمی، سہیل احمد نقوی، عبدالحمید، حمیدہ فخر، آمنہ مصطفیٰ، شکیلہ یعقوب وغیرہ سے خاص تعلق رہا اور یہ تعلق دیرپا ثابت ہوا ان سب کی یاد کبھی کبھی آتی ہے۔

کراچی یونیورسٹی میں داخلہ

بی ٹی کرنے کے بعد اسی سال کراچی کے سرشتہ تعلیم سے منسلک ہو گیا گویا مجھے اپنی پسند کا مشغلہ مل گیا۔ اس وقت کراچی یونیورسٹی کی کلاسیں موجود آرٹس اردو کالج کے آس پاس کی عمارتوں میں لگتی تھیں۔ انگریزی اور اردو کے شعبے نانک باڑہ میں ایک مخدوش سی عمارت میں سبزی مارکیٹ اور لکڑی کی بڑی ٹال کے قریب واقع تھے۔ میں جس سرکاری اسکول میں پڑھاتا تھا وہ شعبہ اردو سے بہت قریب تھا۔ اسکول دو شفٹوں میں لگتا تھا اور میرا تعلق دوسری شفٹ سے تھا اس لیے کہ اس میں حاضری کچھ ایسی مشکل نہ تھی لیکن میری رہائش بہت دور ملیر سٹی میں تھی، اس لیے روز صبح سویرے نکلتا پہلے یونیورسٹی جاتا پھر اسکول جاتا اور پانچ بجے فرصت پا کر لوکل ٹرین سے ملیر کا سفر کرتا آسان نہ تھا، تڑکے کا نکلا بہت رات کو گھر پہنچتا تھا لیکن چاروناچار سب کچھ کرنا پڑتا تھا۔ ایم اے سال اول کی کلاسوں میں بھی بہت کم حاضر رہ سکا۔ ایک تماشا اور ہوا مجھے ۱۹۵۶ء میں پریویس کے امتحان میں شریک ہونا تھا چنانچہ شریک ہوا لیکن کچھ دنوں سے ہفتے کی تعطیل چونکہ اتوار کے بجائے جمعہ کو ہونے لگی تھی اس لئے آخری پرچہ جمعہ کو نہیں اتوار کو ہونا تھا اور میرے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ اتوار کو چھٹی کا دن ہے اس لیے غضب یہ ہوا کہ میں اتوار کو واقعی چھٹی مناتا رہا،

دن پھر تیاری کرتا رہا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ متعلقہ پرچہ تو کل ہو چکا، سر پیٹ کر رہ گیا۔ اس وقت یہ آسانی نہ تھی کہ اگر کوئی پرچہ چھوٹ جائے تو اس کا امتحان دوسرے سال دے دیا جائے۔ نتیجتاً پورا سال خراب ہوا سخت کوفت میں گزارا اگلے سال پھر سارے پرچوں کا امتحان دیا اور بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہوا۔

پریویس میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے چار طالب علموں میں میرا نام بھی تھا اس لیے اس وقت کے قاعدے کے مطابق سال بھر کے لئے نوے روپے مہینے کا وظیفہ ملنے لگا اس وقت نوے روپے بہت ہوتے تھے کہ یونیورسٹی اور کالج کے اساتذہ کو بھی عموماً دو سو سے لے کر صرف دو سو پچاس روپے تک ماہانہ ملتے تھے۔ اب میں نے اردو سال آخر میں قدرے توجہ صرف کی۔ اردو کے نامور محقق اور ادیب مشفق خواجہ صاحب میرے اس وقت کے دوست ہیں کہ وہ بھی شعبہ اردو کے باقاعدہ طالب علم تھے، ان کے میرے تعلقات شروع ہی سے خوشگوار رہے اور بحمد اللہ آج بھی بہت قریب ہیں۔ اتنے قریب کہ ہم ایک دوسرے کی تعریف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے۔ شعبۂ اردو میں داخلے سے پہلے، میری، ان سے کوئی ملاقات نہ تھی لیکن ان کی یہ بات میرا دل خوش کرتی تھی کہ وہ میرے بعض مضامین جو اس وقت "نگار" اور "ادبِ لطیف" کے پرچوں میں شائع ہو چکے تھے، اور جن کا تعلق ایم۔ اے سال دوئم کے بعض نصابی موضوعات سے بھی تھا، وہ خوشدلی کے ساتھ دوسرے ہم جماعتوں کو دکھاتے تھے اور بتاتے تھے کہ یہ شخص جو آپ کا ہم جماعت ہے یہ مضامین اسی کے ہیں۔ ان کے اس طرزِ عمل سے ظاہر ہے میرا دل خوش ہوتا تھا، پھر میرے ساتھ، ان کا حسن سلوک بڑھتا چلا گیا اور ہمارا تعلق ایک دوسرے کے ساتھ پختہ تر ہوتا چلا گیا۔

ایم۔ اے فائنل میں ایک پورا پرچہ، مضمون نویسی کا ہوتا تھا اور بعض یونیورسٹیوں میں آج بھی ہوتا ہے، میں نے "اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء" انتخاب کیا۔ ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب نگران مقرر ہوئے۔ پروفیسر وقار عظیم اور مولانا حامد حسن قادری ممتحن مقرر ہوئے اور مجھے اس میں

سب سے زیادہ نمبر ملے کہ یہ بہت پہلے سے میری تحقیق کا موضوع تھا اور رباعی سے متعلق میرے کئی مضامین معیاری ادبی پرچوں میں چھپ چکے تھے۔ ایک اور بات کا ذکر ضروری ہے، ایک سال پہلے رباعی کے موضوع پر پریوس کے ایک طالب علم تحقیقی مقالہ لکھ چکے تھے اور اچھے نمبروں سے کامیاب بھی ہو چکے تھے چنانچہ جب میں نے اسی موضوع پر کام کرنے کی اجازت چاہی تو جواب دیا گیا کہ اس پر تو گزشتہ سال کام ہو چکا ہے۔ میں نے مذکورہ مقالہ کسی طرح حاصل کیا اور دیکھا کہ سارے کا سارا مقالہ میرے اس مضمون کی ہو بہو نقل ہے جو ''نگار'' کے اصناف سخن نمبر ۵۷، اور ''مشرب'' کراچی ۵۵ء کے اردو ادب نمبر میں شائع ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے مطبوعہ مقالات کے ساتھ استاذی ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر قیوم صاحب کو وہ مقالہ دکھایا تو وہ حیران رہ گئے اور مجھے رباعی پر کام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔

فائنل امتحان میں میں نے فرسٹ ڈویژن اور پہلی پوزیشن حاصل کی اور پھر اسی کے توسط اور شعبہ اردو کے صدر استاذی ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے التفات خاص سے میں شعبہ اردو سے منسلک ہو گیا، اس کی بھی ایک پوری داستان ہے۔ شعبۂ اردو کے اساتذہ میں ڈاکٹر سید شاہ علی صاحب اور قدرت اللہ فاطمی شامل تھے۔ جز وقتی اساتذہ میں پروفیسر حبیب اللہ غضنفر، پروفیسر عبدالسلام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ محب دیرینہ ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی بھی جز وقتی استاد ہو گئے تھے لیکن عجیب اتفاق ہے کہ کلاس میں نہ وہ مجھے کبھی پکڑ سکے اور نہ میں انہیں پکڑ سکا۔ چنانچہ فتح پور اور کانپور سے جو دوستی اور بے تکلفی چلی آ رہی تھی وہ برقرار رہی اور دونوں شاگردی اور استادی کے جھمیلے سے محفوظ رہے۔ شعبۂ اردو کے سال اول و دوم کے اس وقت کے طلبہ میں جو مجھے اچھی طرح یاد ہیں اور جنہوں نے شعر و ادب میں نام بھی پایا ان میں مشفق خواجہ، فرید جاوید اور حسن عابد خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹریٹ کی ڈگری

شعبۂ اردو سے منسلک ہوتے ہی میں نے ڈاکٹریٹ کے لیے داخلہ لینا چاہا لیکن صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر صدیقی اسی اثناء میں وزیٹنگ پروفیسر ہو کر امریکہ چلے گئے اس لیے قدرے تاخیر ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے موضوع پوچھا میں نے کہا ''۱۹۳۶ء کے بعد اردو تنقید'' یہ خیال اس لیے آیا تھا کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب ۱۹۴۵ء تک کی تنقید پر تحقیقی کام کر چکے تھے۔ ان کا وقیع مقالہ شائع ہو چکا تھا اور میں چاہتا تھا اس سلسلے کو مکمل کر لیا جائے لیکن ڈاکٹر صدیقی نے مشورہ دیا کہ ڈاکٹر گیان چند نے ''اردو کی نثری داستانوں'' پر کام کیا ہے اگر اردو کی منظوم داستانوں کو موضوع بنا لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ میں نے اسی موضوع کو اپنا لیا۔ موضوع بہت پھیلا ہوا تھا اور اسے سمیٹنے کا کام بہت مشکل تھا لیکن میں نے ڈاکٹر صدیقی صاحب کی رہنمائی میں اپنا کام بہر حال مکمل کر لیا اور مجھے ۱۹۶۴ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی۔

ڈی لٹ کی ڈگری

۱۹۷۲ء میں، میں نے اپنی کتاب ''اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، ڈی لٹ کی ڈگری کے لیے جمع کرا دی۔ پانچ ممتحنوں میں دو ممتحن بیرون ملک سے بھی مقرر ہوئے، ایک لندن یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر رالف رسل، دوسرے جرمن پروفیسر ڈاکٹر اینماری شمل، ڈاکٹر شمل نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ مقالے کا موضوع میری دسترس سے باہر ہے ڈاکٹر رالف رسل نے پہلے معذرت چاہی پھر یونیورسٹی کے اصرار پر اس پر رائے دی اور بہت تعریف کی۔ ڈاکٹر شمل کی جگہ بعد میں کوئی دوسرا ممتحن مقرر ہوا نام یاد نہیں غرض یہ کہ پانچوں ممتحن کی تنقیدی رپورٹیں دو سال کے اندر موصول ہو گئیں اور مجھے ۱۹۷۴ء میں کراچی

یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری مل گئی۔ پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی تحقیق کے مطابق پاکستانی جامعات کا میں پہلا استاد ہوں جس نے اردو زبان و ادب کے حوالے سے پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔

⑥ ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری: تنقیدی تناظر''

جادۂ نقد پر قلم کا سفر

معاصر تنقید کے منظر نامہ پر نگاہ ڈالیں تو عجب افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم نظر آتا ہے ایک انتہا پسند خود پسند ناقدین ہیں جن کے لیے تخلیق ایسی مکھی ثابت ہوتی ہے جسے وہ ناقدانہ ناک پر بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ کچھ گروہ پسند ہیں تو بعض دشنام طراز، کچھ متعصب تو بعض تنگ نظر جب کہ ان کے برعکس اُن ناقدین کی بھی کمی نہیں جو کسی کو کچھ نہیں کہتے جنہوں نے اور جنجل بات نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے اور جو تنقید کے نام پر کالج نوٹس لکھتے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر اگر ادب کے سنجیدہ طالب علم اور تخلیق کار ناقدین کے شاکی ملتے اور تنقید کی عدم افادیت کے قائل ہیں تو یہ باعثِ تعجب نہ ہونا چاہیے۔ تاہم ان کے باوجود کچھ ایسے اہلِ نقد بھی مل جاتے ہیں جن کی تنقیدی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی تحریروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری بھی ایسے ہی ناقدین میں شامل ہیں۔ شامل کیا وہ تو نمایاں تر نظر آتے ہیں پہلی کتاب ''تدریسِ اردو'' (۱۹۶۲ء) سے لے کر تازہ ترین ''ادب اور ادب کی افادیت'' (۱۹۹۶ء) تک ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بڑی استقامت کے ساتھ جادۂ نقد پر قلم کا سفر جاری رکھا جس کا ثمر پینتالیس کتابوں کی صورت میں حاصل ہوا مگر اتنا کام ان کی منزل نہیں بلکہ سنگِ میل قرار پاتا ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اب بھی مستقل مزاجی، محنت شعور اور لگن سے اپنا تنقیدی سفر جاری رکھے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تخلیقی شخصیت برصغیر کے علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ بطور ایک نکتہ رس نقاد اور عقدہ کشا محقق، ڈاکٹر صاحب نے جو کارنامے سرانجام دیے سب اہلِ علم ان سے بخوبی واقف ہیں۔ دنیائے علم میں ان کی دلچسپیاں متنوع ہیں جس کا اندازہ ان کی کتابوں سے بھی ہو جاتا ہے ''اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری''، ''اردو کی منظوم

داستانیں"، "زبان اور اردو زبان"، "اردو املا اور رسم الخط"، "اردو کی نعتیہ شاعری"، "اردو رباعی فنی و تاریخی ارتقاء"، "میر انیس حیات اور شاعری"، "تحقیق و تنقید"، "دریائے عشق اور بحر المحبت کا تقابلی مطالعہ"، "نواب مرزا شوق کی تین مثنویاں"، "تاویل و تعبیر"، "نیا اور پرانا ادب"، "ہندی اردو تنازع"، "ارمغان گوکل پرشاد"، "غالب شاعر امروز و فردا" اور "اقبال سب کے لیے"۔ یہ محض کتابوں کے نام نہیں بلکہ نقد ادب میں فکر و نظر کے نئے زاویے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کی تنوع پسندی کے مظاہر "اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" اپنے موضوع پر ایک ایسی جامع کتاب ہے جسے بلاشبہ تذکروں کے مطالعہ میں سب سے اہم اور وقیع تالیف قرار دیا جاسکتا ہے۔ اب تک اس موضوع پر صرف ڈاکٹر سید عبداللہ کی ایک چھوٹی سی کتاب دستیاب تھی لیکن ڈاکٹر فرمان صاحب نے اوریجنل سورسز (Sources) سے کام لے کر نہ صرف یہ کہ تذکروں کی تاریخ مکمل کی بلکہ نقد ادب میں ان کی اہمیت اور قدر و قیمت بھی متعین کی ہے۔

"اردو کی منظوم داستانیں" ایک اہم کتاب ہے۔ ایسی کتاب جو اس موضوع پر حوالے اور سند کی چیز بن چکی ہے یہاں بھی ڈاکٹر صاحب نے کمال محنت سے کام لے کر دائرہ تحقیق کو وسعت دی اور ناقابل حصول مخطوطات کی امداد سے اردو کی بعض نایاب منظوم داستانوں کو کھوج لگا کر اور ان کا محاکمہ کر کے اردو ادب کی تاریخ میں نئے ابواب کا اضافہ کیا ہے۔

"غالب شاعر امروز و فردا" میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی محققانہ کاوشوں سے کلام غالب اور اس سے وابستہ بعض اہم جزئیات کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے غالب کی شاعری اور اس کی فکر کے بعض پہلوؤں پر تنقیدی نگاہ بھی ڈالی ہے۔

سال اقبال میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی عطا "اقبال سب کے لیے" ہے۔ یہ مبسوط کتاب فکر اقبال کے اہم ترین گوشوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے فلسفہ خودی، اقبال کے تصور تعلیم، اقبال کا فن اور نظریہ فن، کلام اقبال میں عقل و عشق کی آویزش، اقبال اور نئی نسل میں اہم موضوعات کا احاطہ کیا ہے کہ ان ہی پر فکر اقبال کی اساس استوار ہے۔

تنوع اساس انداز نقد

معاصر تنقیدی منظر پر نگاہ دوڑائیں تو مختلف تنقیدی دبستانوں، متنوع نظریات اور ناقدین کی انفرادی بصیرت (یا اس کی کمی) کے باعث گلشن کا کاروبار خوب چلتا نظر آتا ہے۔ ایک انتہا پر وہ انتہا پسند ناقدین ہیں جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتے، جن کے مزاج کی جارحیت متشددانہ تنقیدی رویہ میں اظہار پاتی ہے۔ ان کے پہلو بہ پہلو تنقید کو دشنام کی سطح پر لے آنے والے بھی ملتے ہیں جن کے لیے نقادین کا لفظ لکھنے کو جی نہیں مانتا اور پھر دوسری انتہا پر ایسے بھولے بھالے حضرات بھی پائے جاتے ہیں جو "تلسی کھڑا بجار میں سب کی مانگے کھیر" کے مصداق ہر ادیب کے دوست اور ہر تحریر کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ الغرض گلشن نقد میں بھی میر کے بموجب "گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگ گل سے" کا عالم نظر آتا ہے۔

زود رنج شعراء حساس ادیبوں اور مریضانہ حد تک بڑھی ہوئی نرگسیت کے شکار معاشرہ میں آپ خواہ خود کو کتنا ہی غیر جانبدار، الگ تھلگ اور لاتعلق رکھیں مگر کسی نہ کسی طرح نزاعات میں ملوث ہو ہی جاتے ہیں بلکہ "آزاد" قلم کار تو سب طرف سے مارا جاتا ہے کہ گروہی تعصب کے مریض اسے جب اپنے جیسا نہیں پاتے تو دشمن کے کیمپ کے جاسوس کا لیبل چسپاں کر دیتے ہیں یوں "خود مختار" ادیب ہمیشہ خسارہ میں دیکھا گیا۔ اب اس "خسارہ" کی نوعیت نہ پوچھیے گا۔

بحیثیت مجموعی پاکستانی معاشرہ انحطاط کی جس ڈھلوان پر پست سے پست تر ہوتا جا رہا ہے اس نے جہاں قومی اداروں کو تباہ کیا وہاں تخلیق کار اور ناقدین بھی اس کے مضر اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اگر انحطاط کا یہ عمل اسی تیز رفتاری سے جاری رہا تو انشاء اللہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب تخلیق کار دریوزہ گر اور نقاد بلیک میلر کہلائے گا۔

تاہم اس شعلہ بداماں گلشن ادب میں جب ڈاکٹر فرمان فتح پوری پر نگاہ جاتی ہے تو وہ اپنی ذات میں عافیت کا جزیرہ نظر آتے ہیں اور ان شخصیات میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں جن

کے قول وفعل میں تضاد نہیں ہوتا اور اسی لیے جن کی دل سے عزت کی جاتی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس کا علم ہے کہ انھوں نے کس طرح نئے لکھنے والوں کی سرپرستی کی، ان کی حوصلہ افزائی کی اور ان کی تحریروں کی نوک پلک درست کر کے "نگار" کی زینت بنایا۔ "نگار" سے یاد آیا کہ نیاز فتح پوری کی وفات کے بعد ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف یہ کہ نیاز اور نگار کا نام زندہ رکھا بلکہ "نیاز خطبات" کی صورت میں ایک ایسا ادبی فورم فراہم کر دیا جو اب ترقی پسندی، آزاد خیالی اور تصوراتِ نو کے فروغ کے لیے فعال کردار ادا کر رہا ہے۔

ادب وتنقید کے فروغ میں "نگار" کا کردار تاریخ ادب کا حصہ بن چکا ہے۔ نیاز فتح پوری جیسی قد آور شخصیت کے بعد "نگار" کو نیاز کے معیار پر چلانا آسان کام نہ تھا مگر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نہ صرف یہ کر دکھایا بلکہ اپنی اختراعی طبیعت سے اس میں بعض جدتیں بھی پیدا کیں۔ جن میں سے ذاتی طور پر مجھے قدیم، کمیاب اور نادر کتب کی اشاعت بے حد پسند آئی کہ یوں ناقابلِ رسائی کتابیں "نگار" کے صفحات میں محفوظ ہو کر عام دسترس میں آ گئیں۔ ایسے کام کی اہمیت کو محقق اور ادبی مورخ ہی سمجھ سکتا ہے۔

معتدل مزاج نقاد

جس طرح تخلیق کار کی شخصیت کی اساس بننے والے لاشعوری محرکات بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر تخلیقات میں رنگ آمیزی کرتے ہیں (جبھی تو شعروں کا انتخاب دل کا معاملہ کھول دیتا ہے) اس طرح کسی نقاد سے مخصوص تنقیدی نظر، تنقیدی حس کی تشکیل اور پختگی میں بھی لاشعور کسی نہ کسی حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی سے مولانا حالؔی، مولانا آزادؔ، اور شبلیؔ نعمانی کے اندازِ نقد اور اسلوبِ نقد میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ آزاد حالؔی جیسے اسلوب میں "آبِ حیات" نہ لکھ سکتے تھے نہ ہی حالؔی "موازنہ انیس و دبیر" لکھنے پر قادر تھے معاملہ علم کی کمی کا نہیں بلکہ طرزِ احساس کا ہے، اسی طرح معاصر ناقدین کی تنقیدی حس اور تنقیدی اسلوب کا بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے یہی نہیں بلکہ اس

سے کسی حد تک اس امر کا بھی تعین کیا جا سکتا ہے کہ مختلف ناقدین کے مطالعہ و کتب میں کیوں تنوع ملتا اور علم کے کسی خاص شعبہ سے خصوصی رغبت کیوں پیدا ہو جاتی ہے، اس حد تک کہ مخصوص سوچ "ٹریڈ مارک" کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اگر یہ لاشعوری محرکات کا کھیل نہیں تو پھر احتشام حسین، کلیم الدین احمد، فراق گورکھپوری، آل احمد سرور، محمد حسن عسکری اور ڈاکٹر احسن فاروقی میں کس بات کا اختلاف ہے؟ جسے عرفِ عام میں رائے کا اختلاف کہا جاتا ہے، وہ رحقیقت وہ شخصیت کا اختلاف ہوتا ہے۔ سنجیدہ، متین، جارح، لڑاکا، انا پسند، کم ظرف، متوازن اور معتدل مزاج شخص اپنے تنقیدی اسلوب اور تنقیدی محاکمہ میں بھی ان ہی کرداری صفات کا مظاہرہ کرے گا یہ دوسری بات کہ مطالعہ علم یا اصطلاحات کے بوجھ سے "متن" کو میوفلاج کر دیا جائے تنقیدی تصورات کا تنوع ناقدین کی شخصیات سے مشروط ہوتا ہے ورنہ سبھی کی تنقیدی تحریریں، دلائل اور فیصلے یکساں کے نکلے ثابت ہوتے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے احباب، شاگرد بلکہ زیادہ نہ جاننے والے حضرات بھی ان کے کرداری مثبت خصوصیات کے معترف ہیں۔ بے تعصب، بے ریا، متوازن مزاج، معتدل طبع، دوسروں کی مدد کرنے والے، احباب کے لیے خلوص کے جذبات رکھنے والے، جونیئرز کی سرپرستی کرنے اور نئے ٹیلنٹ کی حوصلہ افزائی کرنے والے دلدار بھائی جب قلم اٹھاتے ہیں تو ڈاکٹر فرمان کی تنقید بھی ان ہی کرداری اوصاف پر استوار نظر آتی ہے۔ ان کے تنقیدی اسلوب میں تہذیب اور شائستگی کا جو رچاؤ ملتا ہے وہ ان کی شخصیت کا حصہ ہے۔ اسی لیے انھوں نے شعوری طور سے خود کو ادبی نزاعات، گروہ بندیوں اور لسانی تعصبات سے ماورا رکھا جس کا ثمر انھیں قارئین کی عمومی پسندیدگی، شاگردوں کی محبت اور احباب کے خلوص کی صورت میں ملا۔

روشن خیال مفکر

ڈاکٹر فرمان فتح پوری بنیادی طور پر زندگی میں عقلی رویوں کے حامی اور منطقی اثبات کے قائل ہیں یہ پاکستان کے گنتی کے ان چند دانشوروں میں سے ہیں جو ادب، مذہب اور معاشرہ میں روشن خیالی کے حامی ہیں۔ اگرچہ ترقی پسند تحریک سے عملاً تو وابستہ نہ رہے مگر فکری طور پر یقیناً اس سے متاثر ہیں۔ ڈاکٹر فرمان اگرچہ احتشام حسین کی مانند مارکسی نقاد تو نہیں مگر وہ زندگی میں فکری انقلاب کے داعی ہیں۔ اس ضمن میں ان کے مقالے "ترقی پسند تحریک اور احتشام حسین" کی مثال دی جا سکتی ہے جس میں انھوں نے واضح اسلوب میں ترقی پسندی اور اس سے مشروط معاشرتی، ادبی اور عمرانی رویوں کو اُجاگر کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نقاد کے ساتھ ساتھ محقق بھی ہیں اس لیے وہ ہمیشہ شواہد، معلومات اور کوائف کی روشنی میں بات کرتے ہیں چنانچہ ترقی پسندی کو ترقی پسند ادب کو تحریک سے مشروط قرار دینے کے برعکس اس رویہ کی ابتداء کے سراغ میں وہ ۱۹۳۶ء سے بھی خاصے پیچھے گئے ہیں۔ بقول ڈاکٹر صاحب:

> "۔۔۔۔ جسے ترقی پسند تحریک کا نام دیا جاتا ہے وہ دراصل جنگِ عظیم کے بعد رونما ہونے والے سماجی و سیاسی واقعات کے دھارے کا ایک ناگزیر رخ تھا۔ یہ رخ جو ہماری تاریخ میں شعر و ادب سے وابستہ ہو کر سامنے آیا، جنوبی ایشیا میں جنگِ عظیم سے بھی دو ڈھائی پہلے یعنی بیسویں صدی کے آغاز سے کروٹیں لینے لگا تھا۔" ("ادب اور ادب کی افادیت" ص ۹۷)

اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے علامہ اقبال اور ان پر کفر کے فتووں، حسرت موہانی اور پریم چند کا بطورِ خاص تذکرہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا:

> "اردو کا سارا تخلیقی ادب بشمول افسانہ، ناول اور شاعری ترقی پسند تحریک سے بہت پہلے حقیقت نگاری اور اپنے عہد کی ترجمانی کی راہ پر رواں دواں ہو گیا تھا۔" (ایضاً ص ۸۰)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا یہ استدلال نہ صرف زندگی اور ادب میں ترقی پسندانہ رویوں کی اساس فراہم کرتا ہے بلکہ اس کی روشنی میں ہم اس امر کا بھی تعین کر سکتے ہیں کہ تنظیمی لحاظ سے فعال نہ ہونے کے باوجود آج بھی ترقی پسندانہ رویے، عقلیت اور روشن خیالی کے چراغ کیوں فروزاں ہیں۔ ترقی پسندی کے ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے "سیاسی جبر و استبداد، مذہبی تنگ نظری و عصبیت، طبقاتی آویزش و کشمکش اور افلاس و جہالت کے عذابوں" (ایضاً ص ۸۲) کا تذکرہ کیا ہے۔ دیکھا جائے تو ان ہی کے خلاف ردِعمل ترقی پسندانہ رویوں کی اساس فراہم کرتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری بنیادی طور پر روشن خیال دانشور ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنی متفرق تحریروں اور ادبی تنقید کے ساتھ ساتھ "نگار" کے صفحات اور ہر برس ہونے والے نیاز سیمینار تمام ممکنہ ذرائع سے روشن خیالی کے پرچار کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا مقالہ "روشن خیالی اور اردو ادب میں اس کی روایت" (مطبوعہ "فنون" سالنامہ: ۱۹۹۱ء) بھی بطورِ مثال پیش کیا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے روشن خیالی کے فکری سفر میں روشن چراغ بننے والی اہم ہستیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا:

> "روشن خیالی کا جو چراغ شاہ ولی اللہ نے روشن کیا تھا اس کی روشنی ہزار رکاوٹوں کے باوجود سرسید کے جرات مندانہ اقدام سے بہر حال تیز تر ہو گئی، پھر اس کی لو سے مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر، مولانا نیاز فتح پوری اور علامہ اقبال کے ہاتھوں کئی لویں پیدا ہو گئیں۔۔۔ آج کی روشن خیالی میں سب سے گرانقدر حصہ علامہ اقبال کا ہے۔"

میں نے یہ اقتباس بطورِ خاص یہ امر اُجاگر کرنے کے لیے دیا ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح

پوری عام اور مروج تصور کے برعکس ادب معاشرہ اور زندگی میں روشن خیالی کو محض مغرب سے اور ترقی پسندی کو محض اشتراکیت سے مشروط قرار دینے کے برعکس اس خطہ میں ان کے طویل فکری سفر کے قائل ہیں اور یہی درست روّیہ ہے۔ سیاسی جبر، اقتصادی بدحالی اور مذہب کے نام پر تشدد ہر عہد میں نمایاں تر رہا ہے تاہم ان کے خلاف فکری اور تخلیقی سطح پر ردِعمل بھی ہوتا رہا ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ نمایاں تر نظر نہ آتا ہو۔ یہ درست کہ ان ادیبوں کو مغربی افکار و تصورات سے تقویت حاصل ہوئی اتنی کہ سرسید کی تمام سماجی، تعلیمی اور ادبی اصلاحات پر مغرب زدگی کا لیبل چسپاں کر کے انہیں مطعون کیا جاتا ہے اور ترقی پسند ادب کی تحریک کو اشتراکیت کی محض پیداوار قرار دیا جاتا ہے مگر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے استدلال کی رو سے یہ سب ایسے روّیے ہیں جن کے سراغ ماضی میں دور تک ملتے ہیں۔ اسے یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ فیض کے اس شعر:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

سے بہت پہلے غالبؔ یہ کہہ رہا تھا:

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

جبکہ اشتراکیوں سے صدیوں پہلے فرخ سیّد کے زمانے میں جعفر زٹلی نے مہنگائی پر یہ شعر کہا تو بادشاہ نے غضبناک ہو کر اس کا سر قلم کروا دیا:

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہ تسمہ کش فرخ سیر

یوں دیکھیں تو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تخلیق کاروں سے کہیں پہلے ترقی پسندانہ روّیوں اور ان پر مبنی تخلیقات کے سراغ مل جاتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو سوچ کا یہ انداز بہت مرغوب ہے چنانچہ جب بھی موقع ملے وہ اسے اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں "جوش ملیح آبادی انقلابی سوچ کے حوالے سے" بہت اچھی مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقالہ میں انھوں نے جوش کی انقلاب پسندی یوں اجاگر کی ہے:

"کسی شاعر کو شاعرِ انقلاب صرف ان معنوں میں کہا جاتا ہے کہ زندگی کے جن نازک مسائل و موضوعات کو ہاتھ لگاتے ہوئے دوسرے شعراء ڈرتے اور ہچکچاتے ہیں وہ انہیں بے باکانہ و جراءت رندانہ کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ جوش نے یہی کیا ہے، انہوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانہ ہی میں دوسرے ہم عصر شعراء کے برعکس مذہبی تنگ نظری، اجارہ داری اور بے بصری کے خلاف آواز اٹھائی اور خطرناک سے خطرناک موضوعات کو اپنا کر "میرا نعرہ انقلاب و انقلاب" کا ایک ایسا فلسفہ بلند کیا کہ اردو کے ایوان شاعری میں واقعی ایک بھونچال سا آ گیا۔

(ایضاً ص:۹۵)

وہ اس ضمن میں مزید لکھتے ہیں:

"عین جنگ کے زمانہ میں ایک غلام ملک کے شاعر جوشؔ کا یہ روّیہ اور ان کی یہ نظمیں جابر حکمرانوں کے خلاف اعلانِ بغاوت کی ایسی مثالیں ہیں جو ہمارے یہاں کمیاب نہیں نایاب ہیں۔ یہ ایسا روّیہ اور طرزِ سخن ہے جسے صرف شاعری کی انقلابی روح جنم دے سکتی ہے اور جس کے معنوی رُخ کو دعوتِ بغاوت و انقلاب کے سوا کسی اور چیز سے تعبیر ہی نہیں کیا جا سکتا۔"

(ایضاً ص:۱۰۱)

اس کا مطلب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو نقاد انقلاب یا باغی محقق ثابت کرنا نہیں صرف ان کی تنقید کے اس پہلو کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے جو ان کی محققانہ مساعی اور عالمانہ مقالات کے باعث بالعموم عام قارئین کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ آخری بات، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو میرا مشورہ ہے کہ اپنے متوازن انداز اور معتدل اسلوب میں ترقی پسند ادب کی ایک ایسی تاریخ لکھ ڈالیں جو اس توانا اور اہم ترین تحریک سے وابستہ الزامات کے جالے صاف کر کے اس کی مثبت فکری اساس اُجاگر کر سکے۔

محنت کا ثمر

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی زندگی مسلسل محنت سے عبارت ہے۔ علمی مصروفیات کے بعد جو وقت بچتا ہے وہ یونہی سیکنڈل اڑانے میں گزارنے کی بجائے تعمیری مشاغل میں صرف کرتے ہیں۔ ایک دائمی مشغلہ "ملازمت"؛ "نگار" کی ہے۔ جسے سنوارنا ایسا کارنامہ ہے جس پر اردو ادب کے ہر سنجیدہ قاری کو بجا طور پر ان کا ممنون ہونا چاہیے۔ انہوں نے علامہ نیاز فتح پوری کے "نگار" کو سنبھالا دے رکھا ہے۔ دنیائے تنقید میں "نگار" کا کیا مرتبہ ہے اور تحقیق و تنقید میں اس جریدہ کی کیا عطا ہے اس کی بطور خاص وضاحت کی ضرورت نہ ہونی چاہیے کہ اہل علم "نگار" کی قدر و قیمت سے واقف ہیں۔ ڈاکٹر فرمان صاحب نے نہایت نامساعد حالات میں "نگار" کی ڈوبتی نیا کی پتوار سنبھالی اور کسی نہ کسی طرح اسے ڈوبنے سے بچائے رکھا۔ ان کے دورِ ادارت میں "نگار" نے جو گرانقدر نمبرز نکالے وہ اپنے موضوع پر اب حوالے کی چیز بن چکے ہیں "مسائل ادب نمبر"؛ "اکبر الٰہ آبادی نمبر"؛ "سرسید نمبر"؛ "حسرت موہانی نمبر"؛ "اقبال نمبر" اور "ڈاکٹر محمود حسین نمبر" کا بطور خاص تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب یہ سب کیسے کر لیتے ہیں؟ کامیاب محقق ہونا، کامیاب مدیر ہونا، مقبول معلم ہونا، پُرخلوص دوست ہونا، محبت کرنے والا باپ اور بیوی کو خوش رکھنے والا شوہر ہونا، ان میں

سے ہر کام اپنی انفرادی صورت میں چوبیس گھنٹے کا کام ہے۔ ڈاکٹر صاحب اگر واقعی آپ نے کوئی جن قید کر رکھا ہے تو ہمیں بھی اسے بوتل میں بند کرنے کا نسخہ بتاتے جائیے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری آج جس بلندی پر نظر آتے ہیں یہ نہ کسی سیاسی سرپرست کی عطا ہے اور نہ ہی سازشوں کا ثمر، بلکہ یہ ان کی اس محنت، لگن اور صلاحیتوں کی بنا پر ہے جس کا مظاہرہ انہوں نے اپنی تحقیق، تنقید، شعبہ اردو کی سربراہی اور بحیثیت مدیر "نگار" کیا اور ساتھ ہی اردو لغت بورڈ کے سربراہ کی حیثیت سے اپنی انتظامی صلاحیتوں کا بطرز نو اظہار بھی کیا ہے۔ یہ سب کام اور ان پر مستزاد، ان کی علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی سرگرمیاں کہ درحقیقت ڈاکٹر فرمان فتح پوری ان ہی کے مترادف ہے۔ الغرض ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی زندگی محنت، ریاضت اور ذہنی کاوشوں کی طویل داستان ہے اور اس کے باوجود وہ ہنسنے اور لطیفہ گوئی کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ تو فقرہ بازی بھی کر لیتے ہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ وہ مشفق خواجہ جیسی تیز فقرہ بازی نہیں کر پاتے لیکن گفتار کے اسلوب خاص کے حامل بھی ہیں۔ فقرہ بازی تو خیر جملہ معترضہ تھی اصل بات یہ ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری یبوست زدہ نہیں اور نہ ہی وہ "خشکوں" کو پسند کرتے ہیں۔ خوش مزاجی اور بذلہ سنجی مزاج کا وصف خاص ہے۔ اسی طرح حسد، بغض، رقابت اور عداوت کے کانٹوں سے پاک، ان کی خوش اسلوب شخصیت میں پھولوں جیسا رچاؤ ملتا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔

تحقیق کی نرگسیت

بحیثیت محقق، نقاد، اقبال شناس، ماہر لسانیات، ان کے قلم کی قلمرو بہت وسیع ہے۔ چنانچہ تحقیق میں تذکروں ("اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری") مثنویاں ("اردو کی منظوم داستانیں" "نواب مرزا شوق کی تین مثنویاں" "دریائے عشق اور بحر الحبت کا تقابلی مطالعہ") (رباعی "اردو رباعی، فنی و تاریخی ارتقاء") تنقید ("تحقیق اور تنقید"، اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ") اقبال ("اقبال سب کے لیے") غالب ("غالب شاعر امروز و فردا") زبان ("اردو

ہندی تنازع'') املا، (''اردو املا و قواعد'') جیسے موضوعات پر دائمی اہمیت کی کتب تحریر کیں۔

ہمارے ناقدین میں بالعموم ایک خاص قسم کی خودنمائی ملتی ہے جبکہ تحقیق میں نرگسیت اور ان دونوں کی اساس انا پر استوار ہے، اظہار رائے میں نقاد کا رویہ ''سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا'' کے احساس پر مبنی ہوتا ہے تو محقق دوسرے محققین، مورخین یا ناقدین کی غلطیاں یوں پکڑتا ہے گویا دشمن فوج کے قیدی پکڑ رہا ہو۔ حالانکہ علم، معلومات اور کوائف کے معاملے میں کوئی بھی حرف آخر نہیں کہ یہ سب حوالوں کا کھیل ہے جس کے پاس جتنے زیادہ قدیم یا جدید حوالے ہوں گے وہ اتنا ہی اچھا محقق ثابت ہوگا لیکن جدید اور قدیم کا کوئی انت نہیں اس لیے کوئی محقق بھی ہمیشہ کے لیے معتبر اور سند نہیں ثابت ہو سکتا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحقیق (اور تنقید بھی) اس لیے ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' کے انائی احساس سے منزا ملتی ہے کہ بحیثیت محقق وہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں:

''میں کسی رائے کو حرف آخر سمجھنے کی ہمت نہیں کر سکتا اس لیے کہ سائنس ہو
یا ادب آج سے نہیں ہمیشہ سے تحقیق خود تحقیق کی دشمن ثابت ہوئی ہے۔''

(''کتاب سے پہلے'' اردو کی منظوم داستانیں۔ ص:۱۴)

''تحقیق خود تحقیق کی دشمن ثابت ہوئی ہے'' کیا اچھی بات کہی۔ اچھی بات کہی نہیں اس اچھی بات پر عمل بھی کیا۔ اگرچہ اپنی کتابوں میں ڈاکٹر صاحب نے دوسروں سے اختلاف بھی کیا، تردید بھی کی، موقف مسترد بھی کیا اور دلائل و شواہد کی کاٹ بھی کی مگر شائستگی کا دامن تھامے رکھا، قلم کو تحقیر کے لیے استعمال نہ کیا، اسلوب کو انتقامی نہ بنایا اور بحیثیت مجموعی عالمانہ استغناء سے کام لیا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ''تحقیق و تنقید'' کی اشاعت اول (۱۹۶۳ء) میں ''کتاب سے پہلے'' میں تحقیق اور تنقید کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا یہ ان کا موقف بھی ہیں اور شخصیت کے آئینہ دار بھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''یوں تو ''تحقیق و تنقید'' میں بہ اعتبار معنی کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ تحقیق کے معنی ''حق کی تلاش و تصدیق'' کے ہیں۔ تنقید کا لفظ بھی کم و بیش یہی معنی دیتا ہے۔ پھر بھی علمی و ادبی مباحث میں یہ الفاظ نمایاں فرق کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ تحقیق عموماً خارجی و تاریخی واقعات اور الفاظ و محاورات کی چھان بین پر نظر رکھتی ہے، اس کے برعکس تنقید کسی ادبی تخلیق کے حسن اندرون کو نگاہ میں رکھ کر اس کے معیار و حلقۂ اثر کا تعین کرتی ہے۔ لیکن دوسرے علوم پر قیاس کر کے ادب کو تحقیق و تنقید کے خانوں میں بانٹ کر دیکھنا کچھ زیادہ مفید نہیں ہوتا۔ جب تک وثوق سے یہ نہ معلوم ہو کہ کوئی ادب پارہ کس کی تحقیق ہے، کب اور کن حالات میں وجود میں آیا ہے اور جس زبان سے اس کا تعلق ہے اس میں زبان و بیان کی فصاحت و بلاغت کے کیا اصول ہیں اس وقت تک تنقید کا قدم آگے نہیں بڑھ سکتا اور اگر اسے قدم آگے بڑھاتا ہے تو تحقیق کا سہارا لینا ہوگا۔ یہی حال تحقیق کا ہے تنقیدی شعور سے بے نیاز رہ کر وہ اپنی ادبی اہمیت نہیں منوا سکتی اگر اسے ادب کا مستقل جزو بننا ہے تو غیر ضروری مسائل کو نظر انداز کر کے صرف اہم اور افادی امور کو ادبی تحقیق کا موضوع بنانا ہوگا۔ ایسے اہم اور افادی امور جن سے تنقید کی نئی راہیں کھلتی ہیں اور جن کے وقوف سے ادب کے عام قارئین ایک قسم کی طمانیت محسوس کرتے ہیں۔ میں نے ان مضامین میں تحقیق و تنقید کے اس باہمی تعلق اور افادیت کو حتی الوسع اپنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش ظاہر ہے کہ کسی موضوع پر بھی حرف آخر کی حیثیت نہیں رکھتی۔ ادب میں کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوا کرتی لیکن اس کو حرف مکرر بھی نہیں کہہ سکتے۔'' (ص:۳)

تحفۂ درویش

ڈاکٹر صاحب کسی ادبی مافیا کے گاڈ فادر نہ بنے، نہ ادبی حوارے پالے اور نہ ہی تشہیر کے لیے زرِ کثیر صرف کیا، صرف قلم پر انحصار کیا اور قلم نے شہرت کا تاج ان کے سر پر رکھا۔ دیکھا جائے تو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی مثال سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شہرت کا کوئی شارٹ کٹ نہیں۔ صرف محنت، جستجو، سعیِ مسلسل سے ہی اس کا حصول ممکن ہے۔ یوں محنت سے حاصل کردہ شہرت وقتی کے برعکس دائمی ثابت ہوتی ہے کہ اس کی اساس سیاست، گروہ یا زر کے برعکس قلم اور تحریر پر استوار ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے میری نیاز مندی کا رشتہ گزشتہ پچیس تیس برس پر استوار ہے۔ میرے تنقیدی مقالات کے اولین مجموعہ "نگاہ اور نقطے" پر ڈاکٹر صاحب نے بہت خوبصورت تبصرہ کیا تھا۔ حالانکہ تب تک ہماری ملاقات بھی نہ ہوئی تھی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک نئے لکھنے والے کے کام کو سراہتے وقت انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ یہ کون ہے، کس شہر کا ہے اور اس کی سیاست کیا ہے۔ ایماندارانہ سرپرستی کی، یہ ان کی تنقیدی حس کا وصف خاص ہے چنانچہ کراچی میں جہاں ان کے شاگردوں کا بے حد وسیع حلقہ موجود ہے نہ جانے انہوں نے کتنوں کو لکھنا سکھایا، کتنوں کی حوصلہ افزائی کر کے ان میں اعتماد پیدا کیا، کتنوں کو صاحبِ کتاب بنا دیا، یہ بھی ادب و نقد کے لیے ان کی بالواسطہ دین اور عطا ہے۔ درویش کا تحفہ سبز پتہ ہوتا ہے ڈاکٹر فرمان فتح پوری جیسے اساتذہ، محققین اور ناقدین کا تحفہ تخلیق کے لیے نیا خون اور تنقید کے لئے نئے اذہان ہی ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی ذات میں فیض کے حامل تو ہیں ہی مگر اسے عام کرنے میں انہوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا اور اسی لیے کراچی میں اب انہیں "شجر سایہ دار" کی حیثیت حاصل ہے۔

گدازیٔ قلب

ہم پیدا ہوتے ہیں تو فرشتوں جیسی معصومیت کے حامل ہوتے ہیں مگر جیسے جیسے بڑے ہوتے ہیں دنیا میں کامیابی کی قیمت، سادہ لوحی، معصومیت، حق گوئی اور تحمل و بردباری کی صورت میں ادا کرتے جاتے ہیں ہم ہوتے کچھ ہیں مگر "پرسونا" (Persona) سے کسی اور ہی روپ میں دنیا والوں کے سامنے خود کو پیش کرتے ہیں۔ میں اس بحث میں نہیں الجھتا کہ ایسا کیوں ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ ایسا ہوتا ہے۔ ہماری شخصیت میں فولاد ہو یا نہ ہو مگر مصافِ زیست میں ہم سیرت فولاد پیدا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کامیاب افراد، بڑے لوگوں، اعلیٰ عہدیداروں، مشاہیر، حکمرانوں وغیرہ کو تو شعوری طور پر نقاب اور لبادہ کا اہتمام کرنا پڑتا ہے، ان کا اچھا اور برا ہونا اسی امر سے طے پاتا ہے کہ انہیں مثبت یا منفی؟ کن مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بھی تکلف کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے، ظاہر ہے، بے تکلف دوستوں سے قطع نظر وہ خود کو ہر ایک کے سامنے اس رنگ میں نہیں پیش کر سکتے جو کہ در حقیقت شخصیت کا رنگ ہے ایسا کرنا مجبوری ہے کہ وہ ایک طرح کا دفاعی حصار ہوتا ہے۔ اس دفاعی حصار کے اندر شخصیت کو چھپانا اس لیے بھی ضروری ہوتا ہے کہ ہر شخص شخصیت کی راست تفہیم کا اہل نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ بیشتر افراد جذبات و احساسات کے تموج کو سرد مزاجی، لاتعلقی اور مردم بیزاری سے کیموفلاج کرتے ہیں۔

مجھے ڈاکٹر صاحب کا دوست ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور میں "فرمان فہم" ہونے کا دعویٰ بھی کر سکتا ہوں لیکن ایک موقع پر ان کا میں نے ایسا روپ دیکھا کہ حیران رہ گیا۔ کراچی میں نگار و نیاز کانفرنس ہو رہی تھی۔ یہ کانفرنس جس میں ہندوستان اور پاکستان کی مقتدر علمی شخصیات جمع تھیں بے حد کامیاب رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے لیے بہت محنت کی تھی اور اس کامیابی سے وہ بہت خوش تھے۔ آخری سیشن میں امراؤ طارق نے ڈاکٹر صاحب کی محنت اور مساعی کا ذکر

کرتے ہوئے ان سے ''محبت کی نسبت'' کی بات کی تو جوابی تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب سینکڑوں کے مجمع کے سامنے آبدیدہ ہو گئے۔ جلسہ میں عجب جذباتی کیفیت پیدا ہو گئی جب مجھے اندازہ ہوا کہ یہ اتنا بڑا ڈاکٹر، محقق، نقاد اور عالم اندر سے تو بالکل بچہ ہے۔ محبت کے دو میٹھے بول جس کی آنکھوں میں آنسو لے آئیں اسے صرف محبت سے حاصل کیا جا سکتا ہے کہ وہ صرف محبت ہی کی زبان سمجھتا ہے۔

مجھے ذاتی طور پر بھی ڈاکٹر صاحب کی گدازیِ قلب کا تجربہ ہے۔ میں نے اپنی کتاب ''مغرب میں نفسیاتی تنقید'' کا انتساب ڈاکٹر صاحب کے نام کیا (اس لیے اظہارِ محبت میں بھی ڈاکٹر صاحب مجھے مات دے چکے تھے کہ وہ مجھ سے پہلے ایک کتاب کا انتساب میرے نام کر چکے تھے) میں نے انتساب کو خفیہ رکھا مقصد ڈاکٹر صاحب کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کرنا تھا، جواب میں ڈاکٹر صاحب نے یہ لکھا:

''۔۔۔خط بھی ملا اور ''مغرب میں نفسیاتی تنقید'' بھی، دونوں کے لیے دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر صحت کے ساتھ دراز کرے اور قلم کو مزید توانا رکھے، اتنا توانا کہ حاسد اپنی آگ میں جلتے رہیں۔

کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو ''انتساب'' میرے نام تھا بھائی سلیم اختر! اب اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے۔ آپ کے اس پرخلوص اقدام سے میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں کہ میں پیار کی مار قطعی برداشت نہیں کر پاتا، دشمنوں کو بھگتنے کے لیے مستعد رہتا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کے بے پایاں اخلاص کا جواب کیسے دوں۔ یہ اخلاص مسلسل ہے اور جس دن سے ملاقات ہے اسی دن سے ہے۔ اللہ اس سلسلہ اخلاق کو مستحکم رکھے۔۔'' (۷ دسمبر ۱۹۹۸ء)

یہ مراسلہ اپنی تعلی کے لیے نہیں بلکہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شخصیت کے اس نرم ترین حصہ کی وضاحت کے لیے لکھا ہے جو چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش سے مملو ہے۔ جسے انہوں نے ''پیار کی مار'' سے تعبیر کیا ہے۔

⑦ غالب کی قدر شناسی

''طرفدارانِ غالب سے لے کر حریفانِ غالب تک سب نے اپنی تحریروں سے اس بات کی شہادت دی کہ غالب فی الواقع ایک نابغۂ فن ہے اور اردو شاعری میں بعض کے نزدیک اس سے بڑے اور برتر شاعر تو ہو سکتے ہیں لیکن اس کا مثل نظیر کوئی نہیں ہے۔'' (۴۱)

سید دلدار علی نے زمانہ طالب علمی میں دیوانِ غالب گھول کر پی لیا تھا لہٰذا فرمان فتح پوری نے غالب شناسی میں اگر خصوصی شہرت حاصل کی تو باعث تعجب نہیں کہ دلدار علی کی تنقیدی حس کی پختگی کے لیے غالب نے اب کڑے معیار کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ یہ کہنا تو مبالغہ ہوگا کہ جس نقاد نے غالب شناسی میں مقام حاصل نہ کیا اور نام نہ پیدا کیا وہ بڑا نقاد تسلیم نہیں کیا جا سکتا تاہم اس بات پر یقیناً زور دوں گا کہ جس نقاد نے غالب پر ڈھنگ کا کام نہ کیا اس کی تنقیدی پختگی میں ایک آنچ کی کسر رہ جانے کا ضرور احساس ہوتا ہے۔

غالب کا دعویٰ ہے:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

تقریباً ڈیڑھ سو برس سے اردو دنیا کے بہترین اذہان نے اپنی تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتیں غالب شناسی کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی سے لے کر ڈاکٹر فرمان فتح پوری تک غالب شناسوں کے تابندہ اسماء کی فہرست طویل بھی ہے اور مرعوب کن بھی اور بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

''۔۔۔غالب کی قدر شناسی کا راستہ ہمیشہ کے لیے صاف اور ہموار ہو گیا افکارِ تازہ سے آراستہ اور علومِ جدیدہ سے مسلح غالب شناسوں کا ایک پورا

قافلہ تیزی سے اس راہ پر چل نکلا اور بیسویں صدی تو پوری کی پوری
غالب کے فکر و فن کی تحقیق و تنقید کے لیے وقف ہو گئی۔" (۲۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے "غالب کے کلام میں استفہام" (مطبوعہ ماہنامہ "نگار" لکھنو مئی ۱۹۵۳ء) سے غالب کی قدر شناسی کے جس سفر کا آغاز کیا وہ بڑی استقامت سے اس پر گامزن ہیں۔ تازہ ترین مقالہ "غالب، دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ اور ڈاکٹر سید معین الرحمن" (مطبوعہ ماہنامہ ماہِ نو لاہور۔ اپریل ۱۹۹۹ء) ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا پہلا مقالہ "غالب کے کلام میں استفہام" اولین اشاعت سے لے کر لمحۂ موجود تک غالب پر متعدد مرتبہ کتب اور معروف ادبی جرائد کے غالب نمبروں میں شائع کیا جا چکا ہے تازہ ترین مثال ماہنامہ "سخنور" کراچی کا غالب نمبر (فروری ۱۹۹۹ء) ہے۔ بہت کم مقالات کو ایسی پذیرائی نصیب ہوئی ہے کہ مصنف کی زندگی ہی میں وہ حوالہ کی چیز بن جائیں۔

واضح رہے کہ یہ مقالہ جوانی کا ہے، ابھی وہ پروفیسر اور ڈاکٹر نہ بنے تھے، کوچہ نقد میں نووارد تھے لیکن پہلے مقالے نے ہی علمی حلقوں میں انہیں معروف کر دیا جبکہ آنے والے مقالات نے بطور غالب شناس ان کی شہرت کو مزید مستحکم کر دیا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی غالب پر دو کتابیں طبع ہو چکی ہیں:

۱۔ "غالب: شاعرِ امروز و فردا" اظہار سنز لاہور ۱۹۷۰ء
۲۔ "تمنا کا دوسرا قدم اور غالب" حلقہ نیاز و نگار کراچی ۱۹۹۵ء
۳۔ "شرح دیوانِ غالب اردو" (زیرِ تحریر)

ڈاکٹر پروفیسر سید معین الرحمن نے شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور کے تحقیقی مجلہ "تحقیق نامہ" (۹۶-۱۹۹۷ء) میں "شرح دیوان غالب" کی اطلاع دی ہے۔ گویا فی الحال غالب پر دو کتابیں اور متعدد تحقیقی و تنقیدی مقالات چھپ چکے ہیں اور ان پر مستزاد ماہنامہ "نگار" کے غالب نمبروں کی ترتیب و اشاعت میں کتابیات اور اشاریہ سازی کے فن میں کورا ہوں اس لیے ان امور

میں ہمیشہ دوسروں سے راہنمائی حاصل کی اور ڈاکٹر سید معین الرحمن کی بھوکی کاوش سے استفادہ کر رہا ہوں۔ عاصمہ وقار نے اپنے ابو کے انداز اور اسلوب میں بڑی محنت سے "غالبیات فرمان کا اشاریہ" (تحقیق نامہ ۹۸-۱۹۹۷ء) مرتب کیا ہے۔ وہ تمہید میں لکھتی ہیں:

"ڈاکٹر فرمان فتح پوری (ولادت ۲۶ جنوری ۱۹۲۶ء) کا غالب کے بارے میں پہلا مضمون ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تو وہ چھبیس (۲۶) برس کے تھے۔ اب کہ وہ بحمد و عمر عزیز کی بہتر منزلیں طے کر چکے ہیں۔ غالب پر تین مستقل کتابوں کے علاوہ ان کے ستر سے زیادہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان کے یہ علمی مضامین متعدد جگہ نقل ہوئے یا انتخاب میں لئے گئے۔ ان سب اشاعتوں کا شمار کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے ان کے ستر سے متجاوز مضامین ایک سو پچاس کے قریب رسائل و جرائد یا کتب میں شامل اور شائع ہوئے۔ پڑھنے والوں کی ایک سے زیادہ نسلوں پر ۱۹۵۳ء سے ۱۹۹۷ء تک کے برسوں میں فرمان فتح پوری کی ان تحریروں (بشمول کتب و مقالات) نے جو اثرات مرتب اور مرتسم کئے ہوں گے، اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔"

غالب کے بارے میں ۱۹۵۳ء سے ۱۹۹۷ء تک کی زمانی حد میں چھپنے والی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتابوں اور متفرق تحریروں کا سال بہ سال گوشوارہ ملاحظہ ہو:

کتابیں:
۱۔ غالب: شاعر امروز و فردا لاہور ۱۹۷۰ء
۲۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب کراچی ۱۹۹۵ء
۳۔ شرح دیوانِ غالب اردو، زیرِ طبع ۱۹۹۸ء

مقالات: ۱۹۵۲ء–۱۹۶۰ء

۱۔ غالب کے کلام میں استفہام
- ۱۔ نگار، لکھنؤ مئی ۱۹۵۲ء
- ۲۔ تحقیق وتنقید، کراچی ۱۹۶۳ء
- ۳۔ نگار، کراچی جنوری فروری ۱۹۶۹ء
- ۴۔ تنقید غالب کے سو سال (فیاض محمود) لاہور ۱۹۳۹ء
- ۵۔ غالب: شاعر امروز وفردا، لاہور ۱۹۷۰ء
- ۶۔ نگار، کراچی فروری ۱۹۸۷ء
- ۷۔ نگار، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۸ء
- ۸۔ ادیب، علی گڑھ جنوری جون ۱۹۹۲ء
- ۹۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی ۱۹۹۵ء
- ۱۰۔ غالب شناسی اور نیاز و نگار (ڈاکٹر سلیم اختر) لاہور ۱۹۹۸ء

۲۔ "مکمل شرح دیوان غالب" پر ایک نظر
- ۱۔ نگار، لکھنؤ جولائی ۱۹۵۴ء
- ۲۔ غالب شاعر امروز وفردا، لاہور ۱۹۷۰ء

۳۔ غالب کے مقطعے
- ۱۔ ساقی، کراچی اکتوبر ۱۹۵۵ء
- ۲۔ غالب: شاعر امروز وفردا، لاہور ۱۹۷۰ء

۴۔ غالب اور اقبال
- ۱۔ نگار، لکھنؤ دسمبر ۱۹۵۵ء
- ۲۔ غالب: شاعر امروز وفردا، لاہور ۱۹۷۰ء
- ۳۔ نگار، کراچی نومبر دسمبر ۱۹۷۷ء

۵۔ غالب اور اقبال (۲)
- ۱۔ نگار، لکھنؤ مئی ۱۹۵۶ء
- ۲۔ غالب: شاعر امروز وفردا، لاہور ۱۹۷۰ء

۶۔ غالب کے اسلوب سخن کا پہلو: طنز
- ۱۔ نگار، لکھنؤ مارچ ۱۹۵۷ء
- ۲۔ نگار، لکھنؤ اکتوبر ۱۹۵۷ء
- ۳۔ نگار، کراچی جنوری فروری ۱۹۶۹ء
- ۴۔ غالب: شاعر امروز وفردا، لاہور ۱۹۷۰ء
- ۵۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی ۱۹۹۵ء

۱۹۶۱ء–۱۹۶۸ء

۷۔ غالب کا ایک گم نام قطعہ
- ۱۔ افکار نو، لاہور فروری ۱۹۶۱ء

۸۔ غالب کا نفسیاتی مطالعہ
- ۱۔ نگار، لکھنؤ نومبر ۱۹۶۱ء
- ۲۔ (کافرنہ بود) فروغ اردو، لکھنؤ غالب نمبر ۱۹۶۸ء
- ۳۔ غالب: شاعر امروز وفردا، لاہور ۱۹۷۰ء

۹۔ اقبال وغالب کا تقابلی مطالعہ
- ۱۔ نگار، لکھنؤ جنوری ۱۹۶۲ء
- ۲۔ نگار، کراچی نومبر دسمبر ۱۹۷۷ء

۱۰۔ رباعی کا ایک اہم دور: غالب وانیس کا زمانہ
- ۱۔ اردو رباعی، طبع اول کراچی ۱۹۶۲ء
- ۲۔ اردو رباعی طبع دوم لاہور ۱۹۸۲ء

۱۱۔ جدید اردو غزل: غالب سے حالی تک
- ۱۔ نگار، کراچی جولائی اگست ۱۹۶۵ء

۱۲۔ غالب اور دوسرے مضامین (نظیر حسنین زیدی)
- ۱۔ نگار، کراچی جنوری ۱۹۶۶ء

۱۳۔ جہان غالب: (کوثر چاند ۱۔ نگار، کراچی نومبر ۱۹۶۶ء
پوری)
۱۴۔ مولانا حامد حسن قادری اور ۱۔ نگار، کراچی نومبر ۱۹۶۶ء
غالب شناسی ۲۔ سیپ، کراچی شمارہ ۸، ۱۹۲۲ء
۳۔ با اضافہ: ادبیات و شخصیات، لاہور ۱۹۹۳ء
۱۵۔ غالب نقش ہائے رنگ رنگ ۱۔ نگار، کراچی مارچ ۱۹۶۷ء
۲۔ ہماری زبان، دہلی مارچ ۱۹۶۷ء
۱۶۔ احوال و نقد غالب ۱۔ نگار، کراچی ستمبر ۱۹۶۷ء
(حیات سیال)
۱۷۔ روح المطالب فی شرح ۱۔ نگار، کراچی مارچ ۱۹۶۸ء
دیوان غالب (شاداں بلگرامی)
۱۸۔ غالب سے متعلق ایک خط اور ۱۔ نگار، کراچی مارچ ۱۹۶۸ء
اس کا جواب:
۱۹۔ غالب در سید ۱۔ ہماری زبان، دہلی ۱۵ نومبر ۱۹۶۸ء
۲۰۔ غالب کی یادگار قائم کرنے کی ۱۔ ہماری زبان علی گڑھ دسمبر ۱۹۶۸ء
اولین تجویز: ۲۔ قومی زبان، کراچی مارچ ۱۹۶۹ء
۳۔ ہندوستانی ادب، حیدر آباد دکن جنوری مارچ ۱۹۶۹ء
۴۔ غالب: شاعر امروز و فردا، لاہور ۱۹۷۰ء
۵۔ سورج، لاہور ۱۹۹۶ء

سال غالب ۱۹۶۹ء

۱۔ ماہ نو، کراچی جنوری فروری ۱۹۶۹ء
۲۔ غالب: شاعر امروز و فردا، لاہور ۱۹۷۰ء
۲۱۔ غالب نسخہ حمیدیہ کی روشنی میں:
۲۲۔ غالب کے اولین تعارف نگار ۱۔ اردو، کراچی جنوری مارچ ۱۹۶۹ء
۲۔ غالب: شاعر امروز و فردا، لاہور ۱۹۷۰ء
۳۔ سورج، لاہور ۱۹۹۶ء
۲۳۔ دیوان غالب سے فال ۱۔ اداریہ، نگار، کراچی جنوری فروری ۱۹۶۹ء
۲۔ قومی زبان، کراچی فروری ۱۹۸۱ء
۲۴۔ غالب کے حالات میں ۱۔ العلم، کراچی جنوری، جون ۱۹۶۹ء
(بعد وفات) پہلا مضمون ۲۔ غالب: شاعر امروز و فردا، لاہور ۱۹۷۰ء
۲۵۔ غالب اور گنجینۂ معنی کا طلسم ۱۔ نقوش، لاہور غالب نمبر، ۱۹۶۹ء
۲۔ نگار، کراچی اکتوبر ۱۹۶۹ء
۳۔ غالب: شاعر امروز و فردا، لاہور ۱۹۷۰ء
۲۶۔ غالب: شاعر امروز و فردا ۱۔ شاعر، بمبئی غالب نمبر ۱۹۳۹ء
۲۔ ہمدرد صحت، کراچی جون ۱۹۳۹ء
۳۔ غالب: شاعر امروز و فردا، لاہور ۱۹۷۰ء
۴۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی ۱۹۹۵ء

۲۸۔ اے کاش کبھی (میں اور غالب)
۱۔ غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں (شکور احسن)
۲۔ راوی، لاہور، غالب نمبر اپریل ۱۹۶۹ء
۳۔ غالب: شاعر امروز و فردا، لاہور ۱۹۷۰ء
۴۔ محمل، مجلہ اسلامیہ کالج برائے خواتین کوپر روڈ، لاہور، ۱۹۷۰ء
۵۔ جزو دیباچہ کتب "تمنا کا دوسرا قدم اور غالب ۱۹۹۵ء

۲۸۔ فلسفہ کلام غالب (شوکت سبزواری)
۱۔ نگار، کراچی جون ۱۹۶۹ء

۲۹۔ غالب ڈائری یو پی ایل
۱۔ نگار، کراچی جون ۱۹۶۹ء

۳۰۔ غالب اور مطالعۂ غالب (عبادت بریلوی)
۱۔ نگار، کراچی اگست ۱۹۶۹ء

۳۱۔ نذر غالب (عطاء الرحمٰن کاکوی)
۱۔ نگار، کراچی ستمبر ۱۹۶۹ء

۳۲۔ ہنگامۂ دلِ آشوب: بسلسلۂ غالبیات (قدرت نقوی)
۱۔ نگار، کراچی ستمبر ۱۹۶۹ء

۳۳۔ محاسن کلام غالب (بجنوری: فخری ایڈیشن)
۱۔ نگار، کراچی ستمبر ۱۹۶۹ء

۳۴۔ صحیفہ غالب نمبر ۱، ۳
۱۔ نگار، کراچی اکتوبر ۱۹۶۹ء

۳۵۔ غالب اور غالب تخلص کے دوسرے شعراء
۱۔ صحیفہ، لاہور اکتوبر ۱۹۶۹ء
۲۔ غالب: شاعر امروز و فردا، لاہور ۱۹۷۰ء

۳۶۔ پنج آہنگ غالب (مرتبہ وزیر الحسن عابدی)
۱۔ اردو، کراچی جنوری مارچ ۱۹۷۰ء

۳۷۔ غالب کا اثر ہمارے ادب اور ادیبوں پر
۱۔ ماہ نو، کراچی فروری ۱۹۷۰ء
۲۔ "کتاب سے پہلے، غالب" وفردا، لاہور ۱۹۷۰ء
۳۔ ماہ نو، جنوری، فروری ۱۹۹۸ء

۳۸۔ پروفیسر حمید احمد خاں اور غالب
۱۔ افکار، کراچی شمارہ ۵۰ سال ۱۹۷۰ء
۲۔ ادبیات و شخصیات، لاہور ۱۹۹۳ء

۳۹۔ اشاریہ غالب (سید معین الرحمٰن)
۱۔ نگار، کراچی مئی جون ۱۹۷۰ء

۴۰۔ دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ (حمید احمد خاں)
۱۔ نگار، کراچی مئی جون ۱۹۷۰ء

۴۱۔ غالب کون؟ (سید قدرت نقوی)
۱۔ نگار، کراچی ستمبر اکتوبر ۱۹۷۰ء

۴۲۔ نقوش غالب نمبر ۲ (محمد طفیل)
۱۔ نگار، کراچی ستمبر اکتوبر ۱۹۷۰ء

۴۳۔ غالب نو دریافت بیاض کی روشنی میں
۱۔ نقوش غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء
۲۔ نیا اور پرانا ادب، کراچی ۱۹۷۲ء

۴۴۔ ادب لطیف غالب نمبر (ناصر زیدی)
۱۔ نگار، کراچی جولائی اگست ۱۹۷۱ء

۴۵۔ غالب اور انقلاب ستاون ۱۔ نگار، کراچی جنوری فروری ۱۹۷۵ء
(ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)

۴۶۔ کیا دیوان غالب نسخۂ امروہہ ۱۔ غالب، کراچی سالنامہ ۷۷-۱۹۷۶ء
واقعی جعلی ہے؟ ۲۔ نگار، کراچی مارچ ۱۹۹۵ء
۳۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب ۱۹۹۵ء

۴۷۔ تحقیق غالب ۱۔ طلیب، مطبوعہ، کراچی ۱۹۸۱ء
(ڈاکٹر سید معین الرحمٰن) ۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور غالب شناس
(تھیسس) (اصبح وحید، لاہور ۱۹۹۶ء ص ۱۳ اور ۲۱۷)

۴۸۔ سوویت جائزہ ۱۔ نگار، کراچی فروری ۱۹۸۲ء
۲۔ نگار، کراچی فروری ۱۹۹۷ء

۴۹۔ غالب اور صادقین کی یاد میں ۱۔ نگار، کراچی فروری ۱۹۸۷ء

۵۰ غالبیاتی مطالعات نیاز ۱۔ سالنامہ نگار، کراچی نومبر ۱۹۸۷ء
۲۔ غالب فن و شخصیت (نیاز فتح پوری)
مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی ۱۹۸۷ء

۵۱۔ غالب کے خطوط ۱۔ نگار، کراچی فروری ۱۹۸۸ء
(ڈاکٹر خلیق انجم)

۵۲۔ (غالب کے معاصر) ۱۔ نگار، کراچی اپریل ۱۹۸۸ء
بہادر شاہ ظفر
(ڈاکٹر اسلم پرویز)

۵۳۔ غالبیات ڈاکٹر انصاری و شمس الرحمٰن فاروقی
۱۔ نگار، کراچی اکتوبر ۱۹۸۸ء

۵۴۔ (غالب دوست) ۱۔ نگار، کراچی فروری ۱۹۸۹ء
مختار الدین احمد کی نذر ۱۹۹۱ء --- ۱۹۹۸ء

۵۵۔ ہم عصر سماجی و تہذیبی مسائل کا ۱۔ سالنامہ صریر، کراچی ۱۹۹۱ء
ادراک اور غالب ۲۔ غالب نامہ، دہلی جولائی ۱۹۹۲ء
۳۔ نگار، کراچی نومبر ۱۹۹۳ء
۴۔ نگار، کراچی مارچ ۱۹۹۵ء
۵۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب،
کراچی ۱۹۹۵ء

۵۶۔ غالب کی فارسی شاعری (ملاحظات) ۱۔ نگار، کراچی جون ۱۹۹۱ء

۵۷۔ غالب کی فارسی غزل ۱۔ نگار، کراچی جنوری ۱۹۹۳ء
(نیاز فتح پوری)

۵۸۔ غالب اور تصوف ۱۔ نگار، کراچی جولائی ۱۹۹۳ء
(محمد مصطفےٰ صابری)

۵۹۔ مشکلات غالب (۱) ۱۔ نگار، کراچی اکتوبر ۱۹۹۳ء
(نیاز فتح پوری)

۶۰۔ مشکلات غالب (۲) ۱۔ نگار، کراچی جنوری ۱۹۹۴ء
(نیاز فتح پوری)

۶۱۔ کلام غالب میں لفظ ۱۔ اوراق، خاص نمبر، لاہور ۱۹۹۳ء
"تمنا" کی تکرار بطور
استعارہ فلسفۂ آثار ۲۔ نگار، کراچی مارچ ۱۹۹۵ء
۳۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی ۱۹۹۵ء

۶۲۔ غالب کی شاعری اور مسائل تصوف

ا۔ سالنامہ صریر، کراچی جون جولائی ۱۹۹۳ء

۲۔ نگار، کراچی مارچ ۱۹۹۵ء

۳۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی ۱۹۹۵ء

۶۳۔ غالب کے اثرات جدید اردو شاعری پر

ا۔ سہ ماہی تمثیل، کراچی جون ۱۹۹۳ء

۲۔ نگار، کراچی مارچ ۱۹۹۵ء

۳۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب کراچی ۱۹۹۵ء

۶۴۔ غالب شکن: یگانہ (نجیب جمال) ا۔ نگار، کراچی اپریل ۱۹۶۳ء

۶۵۔ نسخۂ حمیدیہ سے چند اشعار ۲۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب ۱۹۹۵ء

۶۶۔ مقدمہ بیان غالب (اطہر رضوی) ا۔ کراچی ۱۹۹۵ء

۶۷۔ شارحین غالب ۔ حسرت اور نیاز ا۔ نگار، کراچی مئی ۱۹۹۵ء

۶۸۔ دام آگہی ۔ مغرب میں غالب

ا۔ ادب اور ادب کی افادیت، کراچی ۱۹۹۶ء

شناسی کی تازہ مثال ۲۔ قومی زبان، کراچی فروری ۱۹۹۷ء

۶۹۔ دیوان غالب کی پانچ غزلیں

ا۔ فردا مجلہ گورنمنٹ کالج مری جون ۱۹۹۷ء

تشریح و توضیح

۷۰۔ غالب کی دو غزلوں کی شرح ا۔ تحقیق نامہ، شمارہ ۶، لاہور ۱۹۹۸ء

۷۱۔ شرح دیوان غالب: کیوں اور کیسے؟ ا۔ تحقیق نامہ، شمارہ ۶، لاہور ۱۹۹۸ء

۷۲۔ گنجینۂ معنی کا طلسم اور غالب ا۔ تحقیق نامہ، شمارہ ۶، لاہور ۱۹۹۸ء (۴۲)

۷۳۔ غالب/دیوان غالب نسخۂ خواجہ اور ا۔ ماہ نو ،لاہور ۱۲۲،اپریل ۱۹۹۹ء

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

۷۴۔ دام آگہی: مغرب میں غالب شناسی

ا۔مشمولہ ''ادب اور ادب کی افادیت'' کی تازہ مثال (کراچی: ۱۹۹۶ء)

ہم سخن فہم ہیں

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہر کتاب کا آغاز ''کتاب سے پہلے'' کی صورت میں ایسی پیش لفظ/دیباچہ نما تحریر سے کرتے ہیں جو کبھی کتاب کے موضوع کا تعارف ہوتی ہے تو کبھی اپنے انداز نقد کی صراحت، کبھی اس میں زیر بحث ادبی شخصیت کے حوالہ سے کچھ لکھا جاتا ہے تو بعض اوقات کسی تحریک، نظریہ، تصور کا محاکمہ ہوتا ہے الغرض! ''کتاب سے پہلے'' رسمی دیباچوں کی سطح سے بلند ہو کر مختصر تنقیدی شذرہ کی صورت اختیار کر جاتی ہے، ایجاز میں تفصیل اضافی خوبی ہے۔ شاید اسی لیے ڈاکٹر نجیب جمال نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتابوں میں شامل ''کتاب سے پہلے'' مرتب کر دی تاکہ ادب و نقد سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے تنقیدی منشور کا مطالعہ کر سکیں۔ جب کتاب ''غالب: شاعر امروز و فردا'' کھولیں تو ''کتاب سے پہلے'' میں غالب کے بارے میں یہ سطریں دامن نگاہ کھینچتی ہیں:

''اگر آپ احترام واحتیاط کے ساتھ غالب کے فکر وفن کی بلند چوٹیوں پر نظر ڈالنے کی کوشش کریں اور آپ کی نظر کسی چوٹی تک پہنچ جانے میں کامیاب ہو جائے تو اسی بلند نظری کے نتیجے میں ہو سکتا ہے کہ جو بلندیاں اور خوبیاں بجائے خود آپ کی ذات میں چھپی ہوئی ہیں وہ تیزی سے ابھر کر منظر عام پر آ جائیں اور دوسروں کو آپ کی بڑائی کا قائل بنا دیں۔ یہ بات محض برائے بیت نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو میں کئی ایسے محقق و نقاد ہیں

جو اسی کوشش کی بدولت اپنے ہم عصروں میں ممتاز و سر بلند ہوئے" (۲۳)

جہاں تک میرے ناقص مطالعہ کا تعلق ہے شاید ہی کسی نقاد نے غالب کو یوں "پارس" قرار دیا ہو لیکن اس کے باوجود خود ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے غالب کی طرفداری سے ہی شہرت کمائی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے کام کے وسیع اور متنوع کل میں غالب شناسی جزو کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہاں یہ بات تسلیم کہ بعض جزئیات کی بنا پر یہ جزو بذات خود کل کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شخصیت میں محقق اور نقاد کا معتدل امتزاج ملتا ہے اس لیے میرے خیال میں مقالات کی اس طرح کی فہرست سازی موزوں نہیں کہ فلاں مقالات تحقیقی ہیں جبکہ یہ تنقیدی۔۔۔ میری دانست میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مقالات میں تحقیق اور تنقید شیر و شکر کی مانند ہیں اور ان ہی سے وہ "تحقیدِ نقد" تیار کرتے ہیں یوں دیکھیں تو:

؎ شہر میں حالی نے کھولی ہے دوکاں سب سے الگ

جیسا معاملہ نظر آتا ہے بلکہ اسی استعارہ کو مزید وسعت دیتے ہوئے یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں غالب کے علاوہ بھی متعدد شعبے مل جاتے ہیں۔

دونوں کتابوں میں شامل مقالات کے عنوانات پر صرف ایک نگاہ ڈالنے سے ہی ڈاکٹر فرمان کی غالب شناسی کی متنوع جہات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

۱۔ غالب: شاعر امروز و فردا

غالب کے اولین تعارف نگار__ غالب اور غالب تخلص کے اردو شعراء__ غالب کا نفسیاتی مطالعہ__ غالب اور اقبال (۱)__ غالب اور اقبال (۲)__ غالب کے اسلوب سخن کا ایک پہلو__ "مکمل شرح دیوان غالب" ایک نظر__ غالب کے کلام میں استفہام__ غالب

نسخۂ حمیدیہ کی روشنی میں__ غالب شاعر امروز و فردا__ غالب اور گنجینۂ معنی کا طلسم__ غالب کے مقطعے__ غالب کی یادگار قائم کرنے کی اولین تجویز__ غالب کے حالات میں پہلا مضمون__ اے کاش کبھی معرضِ اظہار میں آوے!

تمنا کا دوسرا قدم اور غالب

کلام غالب میں لفظ تمنا کی تکرار بطور استعارہ فلسفہ آثار__ غالب کی شاعری اور مسائل تصوف__ غالب کے اثرات جدید اردو شاعری پر__ ہم عصر سماجی و تہذیبی مسائل کا ادراک اور غالب__ کیا دیوان غالب نسخۂ امروہہ واقعی جعلی ہے۔ کلام غالب میں استفہام__ غالب کا اسلوب طنز و ظرافت__ غالب کا انداز فکر اور استقبال فردا__ نسخۂ حمیدیہ سے چند اشعار۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مشہور مقالہ "غالب کے کلام میں استفہام" تمہیدی اور اختتامی سطور کے اضافے اور نئے "کلام غالب میں استفہام" کے ساتھ دوسری کتاب میں بھی شامل ہے، "تحقیق و تنقید" میں بھی شامل ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک گھپلا یہ بھی ہوا کہ فہرست میں مقالہ کا عنوان صفحہ ۹۷ پر طبع ہوا جبکہ کتاب میں یہ صفحہ ۱۲۳ پر ملتا ہے ظاہر ہے کاپی پیسٹر کی لاپرواہی کے باعث یہ غلطی سرزد ہوئی۔ تاہم میں اس مقالے کے نئے جنم کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہوں، ہوتا یہ ہے کہ بعض اوقات اضافی مواد سے کسی کمزور/ناقص/خام/مجمل/تشنہ مقالہ میں نئے سرے سے جان ڈالی جاتی ہے لیکن یہ مقالہ تو ڈاکٹر فرمان صاحب کے "جاندار" مقالات میں شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح "غالب: شاعر امروز و فردا" کتاب کا اسی عنوان کا مقالہ "تمنا کا دوسرا قدم اور غالب" میں عنوان کی تبدیلی "غالب کا انداز فکر اور استقبال فردا" کے ساتھ شامل ہے جبکہ مقالہ "غالب کے اسلوب فن کا ایک اہم پہلو" تمہیدی سطور کے اضافہ اور بعض اشعار کی تنسیخ کے بعد نئے عنوان "غالب کا اسلوب طنز و ظرافت" کے ساتھ "تمنا کا دوسرا قدم اور غالب" میں شامل ہے۔ شاید اس طریقہ سے

کتاب کی ضخامت میں اضافہ مطلوب ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک اور کام یہ کیا کہ ان مقالات: غالب: شاعرِ امروز و فردا، غالب کا اسلوبِ طنز و ظرافت، کلامِ غالب میں استفہام کو یکجا کر کے، غالب کا اندازِ فکر اور اسلوبِ غزل کا نیا عنوان دے کر "غزل اردو کی شعری روایت" میں شامل کر دیا۔

غالب: شاعرِ امروز و فردا

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو مجھے "غالب: شاعرِ امروز و فردا" بہت پسند ہے۔ اس مقالہ میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا روشن خیالی پر مبنی فکری رویہ نمایاں تر نظر آتا ہے اور یہی خوبی انہیں غالب کے ہاں بھی نظر آئی اور یہی محرک ہے اس مقالہ کی تحریر کا بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

"غالب کی شاعری اور شخصیت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ زندگی اور فن کے بارے میں ان کے سوچنے کا انداز اور نتائج اخذ کرنے کی روش اپنے معاصرین اور اپنے عہد کے مروجہ اصول اور اقدار سے بہت مختلف تھی۔ ان کا مشاہدہ تیز، ادراک ہمہ گیر اور نگاہ دُور رس تھی۔ برِ عظیم کا نیا تہذیبی دھارا کس طرف جانے والا ہے یا اسے کس طرف جانا چاہیے اور آئندہ اس کے کیا امکانات و اثرات ہوں گے اس کے متعلق وہ فیصلہ کن نتیجے پر بہت پہلے پہنچ چکے تھے۔" (ص ۴۲-۲۲۱)

اور یہی فکری اساس ہے اس مقالہ کی جسے متعدد مستند شواہد سے ثابت کیا گیا ہے۔ غالب کی کتابِ زیست میں حصولِ پنشن کی تگ و دو نے مستقل باب کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ۱۸۲۸ء میں کلکتہ کا سفر اور تقریباً دو برس وہاں قیام .... انحطاط پذیر مغل سلطنت کے دارالحکومت دہلی کے مقابلے میں مغربی ٹیکنالوجی اور سائنسی ایجادات اکتیس سالہ غالب کی آنکھیں خیرہ کرنے کو کلکتہ کافی تھا اور پھر اس پر مستزاد امپورٹڈ شراب کی ارزانی اور لعبتانِ مغرب کی فراوانی! اگر غالب کلکتہ نہ گیا ہوتا تو ۱۸۲۷ء میں سر سید احمد خاں کی مرتبہ "آئینِ اکبری" کی منظوم فارسی تقریظ میں ___ مردہ پروردن مبارک کار نیست ___ ہرگز نہ لکھتا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے غالب

کے قیامِ کلکتہ کے تناظر میں غالب کے خیالات اور اسلوب کی بدلتی جمالیات کا مطالعہ کیا چنانچہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کے بقول:

"۔۔۔ وہ نئی چیزوں کو اپناتے اور انہیں کلام میں راہ دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ الفاظ اور خیالات دونوں کو اپنانے میں یہ روش قائم کی تھی۔ چنانچہ انگریزی عمل داری اور مغربی علوم و فنون کے زیرِ اثر اردو میں جب بعض نئے الفاظ کو ٹکسال باہر قرار دیا۔۔۔" (۲۵)

تو غالب نے اسے تسلیم نہ کیا!

ڈاکٹر فرمان صاحب اسی ضمن میں مزید رقم طراز ہیں:

"فرسودہ خیالات و روایات سے دامن بچا کر چلنے اور تازہ تر میلانات و اقدار کو اپنا لینے کی اس روشِ خاص کا یہ اثر ہوا کہ ان کی سخن گوئی کا انداز بلحاظ مضامین و اسلوب اپنے عہد کے مروجہ اندازِ غزل گوئی سے بہت الگ ہو گیا۔ اتنا الگ کہ وہ اپنے دور کے لیے بڑی حد تک غیر مانوس اور اجنبی ہو گیا۔" (۲۶)

غالب اپنے عہد کے لیے اسی لیے غیر مانوس اور اجنبی تھا کہ وہ ماضی کا سخن گر ہونے کے برعکس شاعرِ فردا تھا!

اس مقالہ کے علاوہ "غالب کا نفسیاتی مطالعہ"؛ "غالب اور گنجینۂ معنی کا طلسم"؛ "غالب کے اسلوبِ سخن کا ایک پہلو" اور "کلامِ غالب میں لفظ تمنا کی تکرار بطور استعارۂ فلسفۂ آثار"، ایسے مقالات ہیں جن کی بنا پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری غالب شناسی کے کڑے سے کڑے معیار پر "کم عیار" ثابت نہیں ہوتے۔

جب میں نے اکادمی ادبیات پاکستان (اسلام آباد) کے لیے ۱۹۹۳ء کی بہترین نثر کا انتخاب کیا تو اس انتخاب میں موخر الذکر مقالہ شامل کیا۔ ملاحظہ ہو "پاکستانی ادب ۱۹۹۳ء، نثر" (اسلام آباد: ۱۹۹۳ء)

⑧ تذکرہ کچھ کتابوں کا

متنوع موضوعات پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتابیں ان کی بوقلموں تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کی مظہر ہیں اور ان پر مستزاد ان کا منطقی روّیہ اور تخلیقی ذہن اس لیے وہ جس موضوع/مسئلہ/شخص/مصنف/تصور پر قلم اٹھاتے ہیں ہر ممکن طریقہ سے اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو ___ وسیع مطالعہ اور کمپیوٹرائزڈ یادداشت ان کے اہم آلات نقد ہیں۔ ذیل میں ان کی ___ سب کہاں کچھ ___ کتابوں کا مجمل جائزہ پیش ہے۔

اردو کی منظوم داستانیں

کراچی: 1971ء

اردو نثر کا آغاز داستانوں سے ہوتا ہے اور ان کے بارے میں تحقیقی مواد اور تنقیدی نظریات کی کمی بھی نہیں۔ صرف "باغ و بہار" ہی پر بہت کچھ لکھا گیا۔ اسی طرح بعض اور مقبول داستانوں کے بارے میں بھی تحقیقی اور تنقیدی نظریات میں خاصا تنوع ملتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر گیان چند جین نے تو "اردو کی نثری داستانیں" لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اب اس پایہ کی ایک اور ممتاز کاوش ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف "اردو کی منظوم داستانیں" ہے۔ خود کتاب کا نام بھی خصوصی توجہ چاہتا ہے اس بنا پر کہ مثنویوں کو منظوم داستانیں قرار دیا گیا ہے اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے مثنویوں کا عالمی سطح پر رزمیوں (Enics) اور دیگر منظوم داستانوں کے تناظر میں مطالعہ کیا جس کی بدولت ہم اردو مثنویوں میں عالمی اہمیت کی حامل منظوم داستانوں یا رزمیوں سے مماثلت یا عدم مشابہت تلاش کر سکتے ہیں۔ نو ابواب پر مشتمل اس کتاب کے مندرجات ۶۰۹ صفحات پر پھیلے ہیں اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے موضوع سے وابستہ تفصیلات، کوائف اور جزئیات کا بڑی کامیابی سے احاطہ کیا ہے۔

یہ کتاب ۱۸۷۰ء/۱۲۸۷ھ تک کی منظوم داستانوں کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ پر مبنی ہے۔ ۱۹۶۲ء میں اس تحقیقی مقالہ کی بنا پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی، یوں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے پی ایچ ڈی ہونے کا اعزاز بھی حاصل کر لیا۔

کتاب کے ابواب پر ایک نگاہ ڈالنے سے موضوع کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

۱۔ منظوم داستانوں کی قدامت اور اہمیت۔
۲۔ منظوم داستانوں کی ہیئت ترکیبی اور فنی لوازم۔
۳۔ اردو میں منظوم داستانوں کا آغاز اور دکنی منظوم داستانیں۔
۴۔ شمالی ہند میں منظوم داستانوں کا آغاز اور سماجی پس منظر۔
۵۔ شخصی منظوم داستانیں یا آپ بیتیاں۔
۶۔ غیر شخصی مختصر عشقیہ منظوم داستانیں۔
۷۔ غیر زبانوں سے ماخوذ داستانیں اور منظوم ترجمے۔
۸۔ بعض طویل اور اہم منظوم داستانیں۔
۹۔ منظوم داستانوں کا عہد عروج و زوال۔

یہ نو ابواب اس وسیع تناظر کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں منظوم داستانوں کا مطالعہ مقصود تھا۔ دراصل اس مقالہ کا اصل مقصد شمالی ہند کی منظوم داستانوں کا جائزہ تھا لیکن موضوع کی منطقی ترتیب کے لیے ان مباحث پر روشنی ڈالنی بھی ضروری تھی۔ شمالی ہند میں منظوم داستانوں کے مطالعہ سے بیشتر ایک باب صرف ان امور کے جائزے کے لیے وقف کیا گیا ہے کہ شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز کن سماجی اور تاریخی عوامل کا مرہون منت تھا۔ اس ضمن میں دبستان لکھنو کے قیام اور اس سے وابستہ اقتصادی اور تہذیبی محرکات کی بطور خاص نشاندہی کی سعی کی گئی ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مقالہ میں منظوم داستانوں کا زمانی لحاظ سے نہیں بلکہ موضوع اور تقسیم کے لحاظ سے مطالعہ کیا گیا ہے اس کا یہ فائدہ ہوا کہ اردو ادب کی تمام

قابل قدر منظوم داستانوں کی درجہ بندی ہوگئی اور یہ بذاتِ خود ایک اہم تنقیدی کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ کاوش ایک اہم تحقیقی تصنیف ثابت ہوئی۔ انھوں نے اپنے موضوع سے متعلق مواد کی تلاش میں قلمی نسخوں اور مخطوطات تک کے بھی حوالے دیئے ہیں اور بیان کی صحت کی دلیل ہے۔ انھوں نے ہر لحاظ سے اپنے موضوع سے انصاف کیا ہے اسی لیے ادبی مورخ، اساتذہ اور طلبہ مستفید ہو رہے ہیں۔ اردو میں مثنوی ایک باضابطہ صنفِ سخن ہی نہیں بلکہ مثنویات کا قابل قدر ذخیرہ بھی موجود ہے۔ آج جو میر حسن، نسیم اور شوق زندہ ہیں تو اپنی مثنویوں کی بنا پر، لیکن ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مثنویوں کی بجائے ان سب کو منظوم داستانیں قرار دیتے ہوئے ان کا اسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کا یہ بیان قابل غور ہے:

"اردو میں منظوم داستانوں کا سلسلہ شاعری کے ابتدائی دور ہی سے شروع ہو جاتا ہے اور انیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک کسی نہ کسی طور پر جاری رہتا ہے۔ اردو کی پہلی منظوم داستان" کدم راؤ پدم راؤ" پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں لکھی گئی اور اس کے بعد یہ سلسلہ ۱۸۷۰ء/ ۱۲۸۷ھ تک برابر قائم رہا، اس کے برعکس نثری داستانوں کا دور قصہ چہار درویش کے اردو ترجمہ ۱۷۷۵ء اور فورٹ ولیم کالج کے قیام (۱۸۰۰ء) کے درمیان زمانہ سے شروع ہو کر ۱۸۷۰ء/ ۱۲۸۷ھ یعنی تہذیب الاخلاق کی تاریخ اجرا پر صرف ۸۰-۷۰ سال کے عرصہ میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ منظوم داستانوں کی تاریخ صرف یہی نہیں کہ نثری داستانوں کے مقابلے میں تقریباً سوا تین سو سال پرانی ہے بلکہ منظوم داستانوں پر قلم اٹھانا گویا اردو شاعری کے پورے چار سو سال کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لینا ہے۔" (ص:۱۲)

ڈاکٹر موصوف نے انھیں منظوم داستانیں قرار دیا۔ اس لیے ان کے تکنیکی لوازم پر روشنی ڈالنا ضروری تھا چنانچہ دوسرا باب اس کے لیے وقف ہے یعنی تاریخی پس منظر کو اُجاگر کرنے کے لیے پہلے باب میں داستانوں کی قدامت کے ساتھ ساتھ عالمی ادبیات اور بالخصوص اساطیر عالم کے تقابلی مطالعات سے دنیا کی قدیم ترین منظوم داستانوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

اردو ادبیات کا آغاز دکن سے ہوتا ہے اس لیے سب سے پہلے دکنی ادبیات کے عمومی جائزہ میں اس دور کی اہم منظوم داستانوں کا مطالعہ اور ان کے فنی لوازم سے بحث کی گئی ہے جو بذاتِ خود جداگانہ تحقیقی کارنامہ ہے۔"

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کتاب کا اختتام ان معنی خیز سطروں پر کیا ہے:

"۔۔۔۱۸۵۷ء کے بعد ایک نئے علمی، ادبی دور کا آغاز ہوا اور ۱۸۷۰ء تک اس نئے دور نے اتنی قوت پکڑی کہ بعض قدیم شعری روایات و اصناف کو نئی روایات و اصناف کے لیے جگہ چھوڑنی پڑی۔ ناول، افسانہ، جدید قومی و ملی نظمیں مقبول ہوتی گئیں اور قدیم طرز کی مثنویاں" واسوخت" "شہر آشوب" اور نثری و منظوم داستانیں متروک ہوتی گئیں لیکن اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ منظوم داستانوں کا ترکہ بے وقعت یا کم مایہ ہے۔ اس کی کلاسیکی حیثیت مسلم ہے، اسی سرمایہ میں متعدد منظوم داستانیں مثلاً" دریائے عشق"، "شعلۂ عشق"، "بحر المحبت"، "سحر البیان"، "گلزار نسیم"، "زہر عشق"، "بہار عشق" اور" قول غمیں" وغیرہ ایسی فن کارانہ نظمیں ہیں جن کی شاعرانہ عظمت و اہمیت ہمیشہ محسوس کی جائے گی۔ انقلابات پہلے بھی آئے ہیں اور آئندہ بھی آتے رہیں گے لیکن یقین ہے کہ وہ ان نظموں کو فنا نہ کر سکیں گے اس لیے کہ ان کی عظمت، عظمتِ فن پر قائم ہے اور فنی عظمت کبھی انقلاب کا شکار نہیں ہوئی!" (ص:۶۷۸)

اردو کی بہترین مثنویاں

لاہور:1993ء

مثنویوں سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی دلچسپی محض ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول کے لیے نہ تھی اسی لیے انھوں نے ''اردو کی منظوم داستانیں'' کے بعد بھی مثنویوں پر کام جاری رکھا اور مثنویوں کے بارے میں مزید تین کتابیں تحریر کر دیں'' اردو کی بہترین مثنویاں'' واقعی اردو کی بہترین مثنویوں کے بارے میں ہے یعنی میر حسن کی ''سحر البیان''، دیا شنکر نسیم کی ''گلزار نسیم'' اور نواب مرزا شوق کی ''زہر عشق''

اردو مثنویوں کی تاریخ، تحقیق اور تنقید کے گہرے مطالعہ کے بعد ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مثنوی کے فن کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا وہ ان کے ذاتی مطالعہ کا نچوڑ ہے۔ ''اردو کی بہترین مثنویاں'' میں ''کتاب سے پہلے'' میں انھوں نے مثنویوں سے اپنی دلچسپی کے بارے میں یہ لکھا:

> ''اس بحث و تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ مثنویوں کے روپ میں ان شاہکار کلاسیکی نظموں کی طرف از سرِ نو قارئین کو متوجہ کر کے ان کے براہِ راست مطالعے پر آمادہ کیا جائے ممکن ہے اس طرح ان مثنویوں کو جانچنے پرکھنے اور آج کی زندگی کے حوالے سے ان کی شاعرانہ قدر و قیمت کا تعین کرنے کی نئی صورتیں پیدا ہوں۔'' (ص:۸)

انھوں نے مثنوی کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

> ''مثنوی کی صنف بہ اعتبار ہیئت دوسری اصناف شعری کے مقابلے میں یوں آسان ہے کہ اس کا قافیائی نظام سخت اور تنگ نہیں ہے۔ ہر شعر کا قافیہ دوسرے شعر سے الگ ہوتا ہے اس لیے شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے اپنی پسند کے قافیوں میں آسانی سے کہہ لیتا ہے۔ موضوع کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ ہر قسم کے داخلی و خارجی موضوع پر مثنوی کہی جا سکتی ہے نہ مثنوی کے اشعار کی تعداد مقرر ہے اور نہ بحر و وزن کی کوئی تخصیص۔ مختصر سے مختصر اور طویل سے طویل مثنوی، جس بحر و وزن میں چاہیں کہہ سکتے ہیں یہی آزادی و آسانی ہے جس نے اردو میں اچھی بری مثنویوں کا ایک انبار لگا دیا ہے۔

> ان مثنویوں کی بدولت یقیناً اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے اور جدید نظم کے لیے اسلوب و اظہار کی بعض راہیں ہموار ہوئی ہیں، لیکن ان مثنویوں میں چند کے سوا سب کی حیثیت محض تاریخی ہے، البتہ مندرجہ ذیل تین مثنویاں:
>
> ۱۔ سحر البیان از میر حسن
>
> ۲۔ گلزار نسیم از دیا شنکر نسیم
>
> ۳۔ زہر عشق از نواب مرزا شوق
>
> ایسی ہیں جنھیں قبول عام و بقائے دوام حاصل ہے۔ ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور شاید آئندہ بھی لکھا جائے گا اس لیے اس کتاب میں انھیں تینوں کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے۔ ہر مثنوی کے پس منظر، محرک، موضوع، داستان، ماخذ، کردار، واقعات، مناظر اور زبان و بیان سب کا جائزہ لے کر اس کے حسن و قبح پر مفصل بحث کی گئی ہے۔'' (ص:۷)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس ضمن میں مزید رقم طراز ہیں:

> ''کتاب کا مطالعہ اس امر کی گواہی دے گا کہ اس کتاب میں جو تین اہم مثنویاں زیر بحث آئی ہیں، وہ صرف تنقید ہی نہیں تحقیق کی کسوٹی پر بھی

پرکھی گئی ہیں اور ان کے سلسلے میں جو تفصیلات دی گئی ہیں، وہ ذاتی کھوج کی بنیاد پر مستند و معتبر ماخذ کے حوالوں سے دی گئی ہیں۔ مثنویات پر تنقیدی و تحقیقی بحث کے آغاز سے پہلے ایک التزام یہ کیا گیا ہے کہ ہر مثنوی کے مصنف کا سوانحی خاکہ مختصر ترین الفاظ میں دے دیا گیا ہے۔ یہ خاکہ قاری کے تاریخی شعور کو مہمیز کرے گا اور اسے مثنوی نگار کے اس عہد خاص اور فضائے حیات میں لے جائے گا جس میں مثنوی کا پس منظر و منظری نہیں پیش منظر بھی روشن تر نظر آئے گا۔" (ص:۸)

اس کتاب سے پہلے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی مثنوی پر دو اور کتابیں بھی چھپ چکی ہیں:

۱۔ "دریائے عشق" اور "بحرالمحبت" کا تقابلی مطالعہ' لاہور:۱۹۷۳ء

۲۔ "فریب عشق"؛ "بہار عشق"؛ "زہر عشق" لاہور:۱۹۷۳ء

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مثنوی پر یہ چار کتابیں قلم بند کر کے جہاں جدید انداز نقد کی کسوٹی پر اردو کی اہم مثنویوں کی فنی حیثیت کا تعین کیا وہاں انہوں نے مثنویوں کے اسلوب کے اساسی خصائص پر بطور خاص توجہ دی۔ یوں انھوں نے آج کے قاری کے لیے اردو مثنویوں کا مطالعہ سہل بنا دیا۔ خود ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے "فریب عشق"، "بہار عشق"، "زہر عشق" کے "کتاب سے پہلے" کا اختتام ان معنی خیز سطروں پر کیا:

"امید ہے اس کی تازہ اشاعت ایک طرف اہل ادب کے ذوق کی تسکین کا سبب بنے گی، دوسری طرف اہل دل کو جی بھر کے رو لینے کا موقع فراہم کر کے زندگی کو گھٹن سے نجات دلائے گی۔"

بقول فراق گورکھپوری:

رو کر عشق خوش ہوا ہے
وقت سہانا اب آیا ہے
(ص:۱۷)

میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کسی اور موضوع پر خامہ فرسائی نہ بھی کی ہوتی تو بھی مثنویوں پر ان کتابوں کی بدولت ایک قابل ذکر محقق اور نقاد کی حیثیت سے خود کو تسلیم کرا سکتے ہیں اور خود کو تسلیم کروانے کے اسی عمل کے حوالے سے مثنوی کی صنف کو بھی — جس کے "لوازم" کے بارے میں انہوں نے "اردو کی بہترین مثنویاں" میں یوں لکھا:

"یہ بات بہت واضح ہے کہ "مثنوی" بہ اعتبار ہیئت مخصوص صنف سخن کہلاتی ہے، ورنہ موضوع و مواد اور تعداد اشعار کی پابندیوں سے وہ یکسر آزاد ہے۔ یہ محض اتفاق اور زمانے کا چلن تھا کہ اردو کی بیشتر کلاسیکی مثنویاں، کسی نہ کسی رومانی قصے کا احاطہ کرتی ہیں۔ وجہ صرف یہ تھی کہ کسی داستان یا واقعے کے لوازم و منازل کو جس آسانی و کامیابی سے مثنوی میں نظم کیا جا سکتا تھا کسی دوسری صنف میں ممکن نہ تھا۔ صرف یہی ایک صنف ہے جس میں تکنیکی دشواریاں کم سے کم ہیں اور جس میں شاعر کی قوت متخیلہ کو اپنی پرواز دکھانے کا پورا موقع ملتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ کسی شاعر کے تسلسل خیال، ربط بیان، موضوع کے تدریجی ارتقا، اس کی ذہانت، شاعرانہ فطانت و ندرت خیال، اس کے احساس تناسب، وسعت مشاہدہ، تخیلی بلندی، نزاکت خیال اور لطیف اسلوب کو پرکھنے کا معیار بھی مثنوی کے سوا کسی اور صنف کو نہیں قرار دیا جا سکتا۔" (ص:۹)

اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری

لاہور: ۱۹۸۲ء

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی اس اہم تالیف ''اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' میں ان تمام توقعات کو پورا کیا ہے جو اب ان کے نام سے وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

تذکروں پر ڈاکٹر سید عبداللہ کی ایک مختصر تالیف ''شعرائے اردو کے تذکرے'' (لاہور: ۱۹۵۲ء) کے علاوہ ہمارے ہاں کوئی باضابطہ اور مفصل کتاب نہیں ملتی۔ اس لیے یہ ضخیم کتاب اس موضوع پر ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر چند اہم ''تذکروں'' کو جدید تنقید کے اہم اصولوں کی روشنی میں تنقید کی کتاب نہ بھی تسلیم کریں پھر بھی ان میں معاصر شعرا کے بارے میں جو سوانحی، ادبی اور تاریخی معلومات ملتی ہیں ان کی بنا پر تذکروں سے دلچسپی بڑھتی ہی رہے گی۔ اس لیے اردو ادب کے محققین اور مورخین ایک ایسی کتاب کی ضرورت کو بڑی دیر سے محسوس کر رہے تھے جو تذکروں کے بارے میں مفصل معلومات اور کوائف بہم پہنچا سکے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ''اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' اس ضرورت کو بطریق احسن پورا کرتی ہے۔

کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے میں تذکرہ نگاری کے فن سے بحث کرتے ہوئے فارسی اور اردو میں اس کے آغاز اور تدریجی ارتقا سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے اردو کے پہلے تذکرے کی بحث کو بڑی خوش اسلوبی سے سمیٹتے ہوئے میر تقی میر کے ''نکات الشعرا'' کو اولیت دی ہے، تذکرہ نگاری کے محرکات سے انہوں نے خصوصی بحث کی ہے۔ اردو تذکروں کی معنوی حیثیت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے مندرجہ ذیل نکات کو بطور خاص ملحوظ رکھا ہے:

۱۔ تذکروں کی کمزوریاں
۲۔ تذکروں کی افادیت
۳۔ تذکروں میں تنقید کی نوعیت
۴۔ تذکروں کی سوانحی اہمیت
۵۔ تذکروں میں ادبی تاریخ کا مواد

دوسرا حصہ اردو شعرا کے تذکروں کے تحقیقی اور تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے اس میں تذکروں کا مفصل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان تمام تذکروں پر کی گئی بحث پر تفصیلی روشنی ڈالنا ممکن نہیں لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس ضمن میں تمام امکانی ذرائع سے فراہمی مواد کے بعد تذکروں کے بارے میں معلومات کو اپ ٹو ڈیٹ کر کے تذکروں پر ہر نوع کا کام کرنے والوں کے لیے بنیادی کوائف بہم پہنچائے ہیں۔

آخر میں اردو شعرا کے تذکروں کی ایک فہرست دی گئی ہے جس میں تذکروں کے مصنف اور زبان کے ساتھ ساتھ سنہ تالیف بصورت ہجری وعیسوی دیا گیا ہے جس سے کتاب کی افادیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

میرے خیال میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ واحد ایسی کتاب ہے جس میں ''کتاب سے پہلے'' کے بجائے ''پیش لفظ'' ملتا ہے اور اس پیش لفظ کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''نگار'' (کراچی: مئی جون ۱۹۶۳ء) کے ''تذکروں کا تذکرہ نمبر'' جو کہ فرمان صاحب کا تحریر کردہ تھا، یہ کتاب اسی نمبر میں مزید مواد اور تازہ کوائف کے اضافہ سے معرض وجود میں آئی ہے۔

نیاز فتح پوری جیسے ادبی جن کی عدم موجودگی میں ''نگار'' کے خاص نمبر کو تنہا لکھنا فرمان صاحب کے لیے بذات خود ایک چیلنج بھی ہو گا لیکن فرمان صاحب علمی لگن سے کام کرنے والے ہیں اس لیے انہوں نے بھاری پتھر کو چومنے پر اکتفا نہ کیا اور ایک مشکل موضوع پر سدا بہار کتاب تحریر کرنے میں کامیاب رہے۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

"یہ کتاب جو ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء سے لے ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء بیچ کے تذکروں پر محیط ہے تذکروں کے سرسری تعارف سے آگے بڑھ کر شعرائے اردو کے تذکروں کی تاریخ اور نامور شعرائے اردو کی فرہنگ بن گئی ہے۔"

(پیش لفظ ص: ۷)

موضوع کی اہمیت، تحقیقی کاوش، فراہمی مواد اور تنقیدی انداز نظر کے باعث جہاں "اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" کو محققین، ادبی مورخین، ادب کے اساتذہ اور ناقدین نے سراہا وہاں اسے منفرد علمی پذیرائی یوں حاصل ہوئی کہ ۱۹۷۴ء میں کراچی یونیورسٹی نے اسی کتاب کی بدولت ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو ڈی۔ لٹ کی ڈگری سے سرفراز کیا اور یوں ڈاکٹر سید معین الرحمن کے الفاظ میں:

"پاکستان کی کسی یونیورسٹی سے وابستہ وہ (ڈاکٹر فرمان فتح پوری) پہلے محقق اور پروفیسر ہیں جنھیں اردو میں پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی اعلیٰ ترین علمی اسناد حاصل کرنے کا امتیاز حاصل ہوا۔" (۲۶)

اقبال سب کے لیے

کراچی: ۱۹۷۸ء

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اگرچہ علامہ اقبال پر صرف ایک کتاب "اقبال سب کے لیے" تالیف کی لیکن اس کے علاوہ علامہ اقبال پر انھوں نے متعدد مقالات قلم بند کیے ہیں۔ ان میں سے بعض مقالات "اقبال سب کے لیے" کے جواب میں تبدیل ہو گئے جبکہ بعض دیگر تنقیدی کتابوں میں شامل ہوئے اور کچھ ہنوز غیر مدون ہیں۔

"اقبال سب کے لیے" دراصل علامہ اقبال کی صد سالہ تقریبات (۱۹۷۷ء) کے موقع پر جامعہ کراچی کے لیے، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے مالی تعاون سے، شائع کی گئی۔ اس کے

ایڈیشنوں کی تفصیل یوں ہے:

۱۔ اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۷۸ء

۲۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۰ء

۳۔ الوقار، لاہور۔ ۱۹۹۶ء

مقالات کی تفصیل درج ذیل ہے:

علامہ اقبال عالمی کانگریس، جامعہ پنجاب (لاہور) کی تین کانفرنسیں منعقد ہوئیں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے تینوں میں مقالات پیش کیے:

۱۔ اول منعقدہ ۲ تا ۸ دسمبر ۱۹۷۷ء مقالہ بعنوان "اقبال اور ورڈز ورتھ"

۲۔ دوم منعقدہ ۹ تا ۱۱ نومبر ۱۹۸۳ء مقالہ بعنوان "اقبال کا سیاسی شعور: طاقتور شعری محرک"

۳۔ سوم منعقدہ ۹ تا ۱۱ نومبر ۱۹۹۸ء مقالہ بعنوان "علامہ اقبال کے فکر و فن کے مشرقی ماخذ"

میں نے ان تین مقالات کا سب سے پہلے اس لیے تذکرہ کیا کہ موضوع، اسلوب اور تدبیر کاری کے لحاظ سے یہ مقالات خاصے کی چیز ہیں بالخصوص آخری دو مقالات۔ جامعہ پنجاب نے کانفرنس میں پیش کردہ مقالات کو فوٹو سٹیٹ کی صورت میں مرتب کر کے مندوبین میں تقسیم کیا تھا۔ ان تینوں "کتابوں" میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مقالات شامل ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اقبال شناسی محض ۱۹۷۷ء سے مشروط نہیں، وہ بہت پہلے علامہ اقبال پر قلم اٹھا چکے تھے۔ یہ امر بھی باعث دلچسپی ہے کہ علامہ اقبال پر اولین مقالہ بحوالہ غالب تھا۔۔۔ میری مراد "غالب اور اقبال" (مطبوعہ "نگار" لکھنؤ، دسمبر ۱۹۵۵ء) سے ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ غالب انہیں اقبال کی طرف لے کر آیا لیکن غالب سے ان کی خصوصی دلچسپی کے تناظر میں اسی مقالے کا مطالعہ دلچسپ ثابت ہوتا ہے۔ معمولی رد و بدل اور نئے عنوان "غالب اور اقبال کا تقابلی مطالعہ" کے ساتھ یہ دوبارہ "نگار" جنوری فروری ۱۹۶۲ء میں اور پھر "غالب: شاعر امروز و فردا" میں شامل کیا گیا۔

''غالب اور اقبال'' پر اثر جلیلی کے اعتراضات کے جواب میں اسی عنوان سے ایک اور مقالہ قلم بند کیا (مطبوعہ نگار دسمبر ۱۹۵۵ء) یہ بھی ''غالب شاعر امروز و فردا'' میں شامل ہے۔

مزید مقالات کی تفصیل یوں ہے:

''اردو کی نعتیہ شاعری اور اقبال'' نگار کراچی مارچ ۱۹۶۸ء

''علامہ اقبال کی بعض نظمیں اور جو ہر'' نگار کراچی مارچ ۱۹۷۶ء

''خودی اور اسلامی تصوف'' نگار کراچی اپریل ۱۹۹۶ء

اردو شعر و ادب پر اقبال کے اثرات'' مشمولہ: ''اقبال شناسی اور نیاز و نگار''

مرتبہ ڈاکٹر طاہر تونسوی لاہور ۱۹۹۸ء

''عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق'' (مطبوعہ ''اقبالیات'' لاہور)

جنوری ۱۹۸۲ء مشمولہ ''اقبال ۱۹۸۲ء'' مرتبہ ڈاکٹر وحید عشرت لاہور ۱۹۹۰ء

''شاعری یا فن اقبال کے نقطہ نظر سے'' مشمولہ ''اقبال کا ادبی نصب العین''

مرتبہ سلیم اختر، لاہور ۱۹۷۷ء

''تحقیقات شادانی پر ایک نظر'' : ''اردو رباعی: فنی و تاریخی ارتقا''

(کراچی ۱۹۶۲ء، لاہور ۱۹۸۲ء) کا ایک باب۔ اس باب میں ڈاکٹر عندلیب شادانی نے علامہ اقبال کی رباعیات پر جو اعتراضات کیے تھے، ان کا مدلل جواب ہے۔ بلحاظ مزاج علامہ اقبال کی رباعی پر جداگانہ مقالہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ صحیفہ لاہور ستمبر ۱۹۵۸ء میں مطبوعہ یہ مقالہ ''تحقیق و تنقید'' (کراچی ۱۹۶۳ء) میں بھی شامل ہے۔

''علامہ اقبال اور اردو غزل میں مشمولہ: ''غزل اردو کی شعری روایت'' (کراچی ۱۹۹۵ء)

یہ فہرست نامکمل ہے لیکن ان مقالات کے عنوانات سے اتنا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال کے افکار سے خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا۔ ''اقبال سب کے لیے'' میں اگرچہ انھوں نے فلسفی اقبال پر شاعر اقبال کو ترجیح دی ہے۔ چنانچہ ''کتاب سے پہلے'' میں وہ رقم

طراز ہیں:

''علامہ اقبال فلسفی بھی ہیں اور شاعر بھی لیکن شاعر کی حیثیت سے ان کا مقام فلسفی سے بلند ہے۔ فلسفہ ان کے یہاں عقل و خرد کا مترادف ہے اور جذب و جنون کے مقابلے میں انھوں نے عقل و خرد کو جو کمتر مقام دیا ہے اور باطنی حقائق کے سلسلہ میں ان کی بے بصری اور نارسائی پر جس طرح اظہار تاسف کیا ہے اس سے اقبالیات کا ہر طالب علم پوری طرح واقف ہے۔'' (صفی الف)

لیکن اس بات کے قائل ہونے کے باوجود ڈاکٹر صاحب اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں:

''اقبال بیسویں صدی کا ایک ایسا عظیم مذکر شاعر ہے جس نے جدید فلسفے کے گہرے مطالعے، انسانی غم خواری کے شدید جذبے اور غیر معمولی فنی بصیرت کی مدد سے مشرق و مغرب دونوں کو یکساں متاثر کیا ہے۔'' (ص: ۷)

اور اسی متوازن انداز نظر کی بنا پر ''اقبال سب کے لیے'' کے مباحث افراط و تفریط کا شکار نہ ہوئے۔ ویسے بھی تنقیدی نرگسیت ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مزاج کا حصہ نہیں اسی لیے ان کی دیگر کتب کے ساتھ ساتھ ''اقبال سب کے لیے'' بھی متوازن انداز نقد کی اچھی مثال ہے۔

''اقبال سب کے لیے'' کا مفصل تجزیاتی مطالعہ ممکن نہیں تاہم ابواب سے کتاب کے دائرہ کار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ ماحول، زندگی اور شخصیت

۲۔ تصانیف اقبال

۳۔ پیغام حیات یا فلسفہ خودی و بے خودی

۴۔ تصور تعلیم

۵۔ سیاسی افکار و تحریک پاکستان

۶۔ دنیائے اسلام اور اقبال

۷۔ اقبال کا فن اور نظریہ فن

۸۔ اقبال کا تصور عقل وعشق

۹۔ اقبال پر مشرق ومغرب کے اثرات

۱۰۔ اردو شاعری

۱۱۔ فارسی شاعر

۱۲۔ اقبال اور نئی نسل

۱۳۔ علمی وادبی دنیا پر اقبال کے اثرات

دیکھا جائے تو ان تیرہ ابواب میں علامہ اقبال کی کائنات فکر کے اہم ترین شعبے آ جاتے ہیں یہی نہیں بلکہ کئی ایسے موضوعات ہیں جن پر مستقل کتابیں قلم بند کی جا چکی ہیں لیکن فرمان صاحب نے فکرِ اقبال کے وسیع تناظر میں سے اساسی جزئیات کا انتخاب کر کے، انھیں ایسے اسلوب میں پیش کیا کہ کوزے میں دریا بند کرنے والی بات سچ کر دکھائی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے تمام تنقیدی کام کو مدِ نظر رکھیں تو علامہ اقبال پر صرف ایک کتاب اور چند مقالات ملتے ہیں۔ میرے خیال میں اگر انھوں نے علامہ اقبال کو اپنا ''پیشہ'' بنالیا ہوتا تو مال بناتے، غیر ملکی دورے کرتے، ''اتھارٹی'' کہلواتے اور اگر علامہ اقبال کے مجاور بن جاتے تو پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی والی بات ہوتی۔ ساتھ ہی یہ کہ مجاوری نالائقی بھی چھپا دیتی لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا اور اتنا ہی لکھا جتنا سوچا۔ اور یہ بڑی بات ہے! ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ''اقبال سب کے لیے'' ربع صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود کارآمد کتاب ثابت ہو رہی ہے۔ گنتی کی جو چند کتابیں سال اقبال کا حاصل قرار دی جا سکتی ہیں، ان میں شمار ہوتی ہے اور اسلوب کی متانت اور متوازن اندازِ نظر کی بنا پر حوالہ کی کتاب بن چکی ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے تھوڑا لکھے کو زیادہ جانو!

زبان اور اردو زبان

کراچی: ۱۹۷۳ء

ڈاکٹر فرمان فتح پوری متجسس ذہن کے حامل فعال قلم کار ہیں اسی لیے وہ زیادہ لکھنے والے ناقدین میں شمار ہوتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کی بیشتر تصانیف پر ان کی علمیت اور تحقیقی ذہن کی چھاپ نمایاں تر نظر آتی ہے۔ یوں متنوع موضوعات، مسائل اور شخصیات پر ان کی کتابیں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں نظر آتی ہیں۔ وحدت میں کثرت کا جلوہ دیکھنا ہو تو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتابیں پڑھیے!

''زبان اور اردو زبان'' ڈاکٹر صاحب کی اردو لسانیات سے دلچسپی کی مظہر ہے۔ ہمارے ہاں لسانیات کے ضمن میں خاصا کام ہوا ہے بالخصوص اردو کی جائے پیدائش، اس کے نام اور آغاز کے بارے میں نظریہ سازی ــ یہ تین اساسی مباحث اردو لسانیات کی بھی اساس قرار پاتے ہیں چنانچہ اردو کے لسانی محققین کی بہترین تحقیقی صلاحیتیں ان موضوعات اور ان سے وابستہ مسائل کو سلجھانے میں صرف ہوئی ہیں۔ اگرچہ لسانی تحقیق میں حافظ محمود شیرانی کے مرتبہ کا شاید ہی کوئی اور محقق ملے لیکن ان کے بعد جن حضرات نے لسانیات سے شغف کا اظہار کیا ان میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری بھی شامل ہیں۔ ''زبان اور اردو زبان'' لسانیات سے علمی دلچسپی کی مظہر کتاب ہے ''کتاب سے پہلے'' میں ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں:

> ''زیرِ نظر کتاب بظاہر مقالات پر مشتمل ہے۔ یہ مقالات اپنے موضوع پر انفرادی حیثیتوں میں میرے نقطۂ نظر سے مکمل ہیں لیکن معنوی غایت کے لحاظ سے یہ سب ایک رشتے میں پروئے ہیں اور پوری کتاب کے ایک وسیع تر موضوع یعنی ''زبان اور اردو زبان'' کا ترجمان بناتے ہیں۔ اس موضوع کے بعض مباحث ومسائل آج بھی ہماری توجہ کا مرکز

خاص ہیں اور کل بھی رہیں گے، اس لحاظ سے اس کتاب کے موضوع کا
تعلق عارضی یا ہنگامی بحثوں سے نہیں بلکہ زبان وادب کی مستقل قدروں
سے ہے۔"

اور مندرجات پر ایک نگاہ ڈالنے سے ڈاکٹر صاحب کی رائے کی اصابت اور اس کے ساتھ کتاب کی قدر وحیثیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ "زبان اور اردو زبان" ــ "اردو کا لسانی خاندان اور دوسری زبانوں سے اس کا رشتہ" ــ "اردو زبان کی جائے پیدائش کا قضیہ" ــ "زبانوں رسم الخط اور اردو رسم الخط" ــ "اردو رسم الخط کی اصلاح کی بعض تجویزیں اور ان کا جائزہ" ــ "اردو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے" ــ "اردو اور پاکستان" ــ "اردو اور علاقائی زبانیں" ــ "اردو الفاظ کی معنوی تقسیم وتفہیم" ــ "اردو شناسی کے بعض نکتے۔" ان عنوانات سے یہ عیاں ہو جاتا ہے ان میں سے بیشتر امور متنازعہ ہیں۔ خاص طور سے پہلے چار مسائل تو ایسے ہیں کہ ان پر بحث کی بازگشت آج بھی قصر لسانیات میں گونجتی ہے۔

لسانیات ہو یا کوئی اور شعبہ علم، ان سے وابستہ نزاعی امور پر لکھنے والے کی شخصیت سے مباحث ایک خاص نوع کی رنگ آمیزی کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کی طبیعت میں جو علم، انکسار اور دوسرے کے کام کی اہمیت کا اعتراف کرنے والی وسیع نظری ملتی ہے، اس نے ان کی تحقیقی کاوشوں پر اپنے مثبت اثرات چھوڑے ہیں۔ اس لیے وہ نزاعی امور پر لکھتے وقت عالمانہ سنجیدگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ وہ اپنا نقطہ نظر بھی پیش کرتے ہیں اور دوسروں کا بھی، وہ دوسرے ناقدین پر تنقید بھی کرتے ہیں اور غلط آرا کی تردید بھی، لیکن یہ سب کچھ متانت اور شرافت سے ہوتا ہے، اس لیے وہ تحقیق کا لٹھ لے کر زمانہ کے سر پر سوار نظر نہیں آتے۔ یہ انداز نظر نزاعی نوعیت کے مقالات میں بہت نمایاں ہے۔

اس کتاب کے مقالات کی جس خصوصیت نے مجھے بطور خاص متاثر کیا وہ ہے زبان کا ایک معاشرتی اکائی کی حیثیت سے مطالعہ! اس انداز نظر کی بنا پر انھوں نے زبان اور بالخصوص اردو

سے وابستہ ثقافتی، تاریخی اور بعض اوقات سیاسی امور کو بھی ملحوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے، اردو سے متعلق لسانی امور کا جائزہ لیا ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحب کے اس نتیجے سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا:

"ہماری معاشرتی زندگی میں تو اردو اس طرح داخل ہو گئی کہ اسے ہم کسی
کے لیے بھی اپنے گرد وپیش سے الگ نہیں کر سکتے۔ پشتو، سندھی، بلوچی اور
پنجابی سب اپنے اپنے حلقوں سے نکل کر دوسروں کے لیے اجنبی ہو جاتی
ہیں۔ لیکن اردو ہر صوبے اور ہر علاقے میں کم وبیش سمجھی اور بولی جاتی
ہے۔" (ص:۱۰۵)

اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ زبان انسانی روابط کا اساسی ذریعہ ہے اور اسی لیے سماج کی تشکیل میں زبان بھی بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایسی واضح حقیقت ہے جسے ثابت کرنے کے لیے لمبے چوڑے دلائل کی ضرورت نہیں۔ شاید دنیا کے دیگر متمدن ممالک میں ایسا ہی سمجھا جاتا ہو گا لیکن اس مملکت خداداد میں اس کے برعکس ہے یعنی اب باہمی نفاق کی بنیاد زبانوں پر استوار ہے۔ ہر صوبے کی زبان کا دوسرے صوبے کی زبان سے تعصب اور پھر ان سب صوبوں کا مل کر اردو سے تعصب۔ لطیفہ یا المیہ یہ ہے کہ لسانی عصبیت کے داعی سیاسی لیڈروں نے انگریزی کی طرف توجہ نہ دی جو غیر ملکی تسلط کی نشانی ہے مگر ہمارے ہاں خوب پنپ رہی ہے اور جیسے انگلش میڈیم سکولوں کی بدولت نئی نسل اردو اور مادری زبانوں کے مقابلے میں انگریزی زیادہ سہولت اور روانی سے بول رہی ہے۔ دیکھیے ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہمیں یہ یاد دلا رہے تھے:

"پاکستان کی تحریک اور اس کی جنگ آزادی میں اردو زبان نے نہایت اہم کردار ادا
کیا ہے بلکہ پاکستان بڑی حد تک اردو ہی کے تحفظ کے لیے خود اردو کے دم قدم سے
وجود میں آیا۔ قائداعظم کی مادری زبان اگرچہ اردو نہ تھی لیکن وہ خوب سمجھتے تھے کہ
پاکستان کے استحکام اور اس کی سالمیت کے لیے پاکستانی مدرسوں میں اردو کی تعلیم
ضروری ہے غالباً انھوں نے اردو کی اسی سیاسی اہمیت کا لحاظ رکھ کر اعلان فرمایا تھا کہ

"پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی۔" (ص:۹۹)

میری دانست میں پاکستانیت کے نقطۂ نظر سے اس کتاب کا مقالہ "اردو اور علاقائی زبانیں" بے حد اہم ہے۔ فرمان صاحب کا تعلق فتح پور سے ہے، اردو کے معلم اور قلم کار ہیں، عمر عزیز کراچی میں گزاری بلکہ کراچی کو "کرانچی" بولتے ہیں مگر ان کے مزاج میں جو وسیع المشربی ہے اور جس غیر متعصبانہ رویہ کے لیے وہ احباب میں معروف ہیں اسی کا عکس اس مقالہ میں بھی ملتا ہے۔ لسانی تعصب کے ماحول میں وہ دیگر پاکستانی زبانوں کے الفاظ، محاورات، تلمیحات، داستانی کرداروں کے اسما اور صوفیا کے شاعرانہ علائم کو اردو زبان میں شامل کر کے اس کے ذخیرہ الفاظ میں اضافی کی تدبیریں بتا رہے ہیں۔ آج ایسا کہنا فیشن بن چکا ہے مگر آج سے ربع صدی قبل ایسی سوچ قومی درد کی مظہر تھی:

"اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے مقبول عام اور اس کے ادب کو پاکستانی ثقافت و قومیت کا متحمل بنانے کے لیے اس میں علاقائی زبان و ادب کی اہم روایات و اقدار کو کیوں نہ داخل کیا جائے۔ مختلف علاقوں کے تاریخی مقامات، تہذیبی مراکز، دریا، پہاڑ، پھول، پھل، باغ و راغ، ندی اور جھیل، قصے، کہانیاں، رسم و رواج، پیر، فقیر، اور صوفی و شاعر سب کو بطور تلمیح و مثال اردو نثر و نظم میں جگہ کیوں نہ دی جائے۔۔۔" (ص:۱۱۲)

اس ضمن میں عملی مثالیں پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے جو نتیجہ اخذ کیا اس سے کسی پاکستانی کو تو اختلاف نہیں ہو سکتا ہاں لسانی لیڈر کی اور بات ہے:

"۔۔۔ جب تک ایسا نہ کیا جائے گا اردو نہ تو صحیح معنوں میں پاکستانی تہذیب اور قومیت کی ترجمانی کا حق ادا کر سکے گی اور نہ اس کے ادب کو پاکستانی ادب کی حیثیت سے الگ پہچانا جائے گا مگر امتیازی رنگ ہی اسے دوسرے ملکوں کے ادب سے الگ کر سکتا ہے۔" (ص:۱۱۳)

اردو املا اور رسم الخط (اصول و مسائل)

لاہور: ۱۹۷۷ء

اگر آپ نے "زبان اور اردو زبان" کا مطالعہ کیا ہے تو پھر آپ کے لیے "اردو املا اور رسم الخط (اصول و مسائل)" کا مطالعہ لازم ہو جاتا ہے اس لیے کہ یہ کتاب بلحاظ موضوع "زبان اور اردو زبان" کی تکمیل کرتی ہے۔ املا اور رسم الخط کے بغیر زبان کا تشخص اور انفرادیت ممکن نہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان دو کی بدولت زبان جو صورت اختیار کرتی ہے اس کی جمالیات کا انحصار بھی انہی پر ہے۔ غالب کی "فردوس گوش" اور "جنت نگاہ" رسم الخط سے مشروط بھی جا سکتی ہے۔ مسلمانوں نے رسم الخط کو سنوارنے میں جس جمالیاتی ذوق کا مظاہرہ کیا، وہ خطاطی کے مختلف اسالیب کی ایجاد کا باعث بنا، ادھر املا کا یہ عالم ہے کہ اب صوتیات کی صورت میں یہ جداگانہ شعبہ علم قرار دیا جا چکا ہے۔ چنانچہ فرد کے آلاتِ صوت اور تلفظ کے باہمی تعلق کا مطالعہ کسی ENT اسپیشلسٹ جیسے انہماک سے کیا جاتا ہے۔ کمپیوٹر سے متعلق کارگزاری بھی اگر ذہن میں رکھیں تو جدید دور میں اس اہم موضوع سے وابستہ علمی تحقیقات کے دائرہ کی وسعت کا کسی حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب اتنی دور تک تو نہیں گئے کیونکہ کتاب کے زمانہ تحریر تک کمپیوٹر نہ تھا لیکن انہوں نے اپنے مطالعہ کی روشنی میں جو کچھ لکھا وہ لائق توجہ ہے۔

غالبیات کی مانند املا اور متعلقہ موضوعات و مسائل سے ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی بہت پرانی ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر صاحب کا مقالہ "اردو املا کے اصول" ماہنامہ "نگار" (لکھنؤ: جون ۱۹۵۱ء) میں شائع ہوا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے بقول:

"اردو رسم الخط کے مسئلہ پر جتنی توجہ دی گئی ہے، اردو املا پر نہیں دی گئی۔۔۔۔ وجہ یہ ہے کہ اردو املا میں آج جس قسم کا مزاج اور انتشار کام کر رہا ہے، وہ اردو کے حق میں

مہلک ہے اور وہ ہمدردانِ اردو کی خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ املا کے قواعد و اصول بنیادی طور پر زبان ہی کے قواعد و اصول ہیں، جب تک یہ قواعد و اصول مرتب و مقرر نہ ہوں اور زبان کے رسم الخط یا تحریر میں ان کی پابندی نہ کی جائے، حقیقی معنوں میں نہ تو کوئی زبان ترقی کر سکتی ہے اور نہ اس کا کوئی بلند معیار قائم ہو سکتا ہے۔" (ص: ۶)

اور اسی جذبہ کے ساتھ یہ کتاب قلم بند کی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اردو عربی فارسی اور انگریزی الفاظ سے جس طرح برمحل مثالیں دی ہیں، وہ نہ صرف متاثر کن ہیں بلکہ ان کے مطالعہ سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ انہیں اردو ڈکشنری بورڈ (کراچی) کا سربراہ کیوں بنایا گیا تھا۔

اس موضوع سے مزید دلچسپی رکھنے والے حضرات ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اس (مرتبہ) کتاب کا بھی مطالعہ کریں:

"اردو املا و قواعد (مسائل و مباحث)" اسلام آباد: ۱۹۹۰ء

"ادبیات و شخصیات"

لاہور: ۱۹۹۳ء

میں گذشتہ سطور میں کئی مواقع پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے قلم کی تنوع پسندی کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ گزشتہ صفحات میں بھی جن چند کتب کا مجمل تعارف کرایا گیا یہ بھی موضوعات، انداز اور اسلوب کے لحاظ سے اردو ادب کی تاریخ کے متنوع پہلوؤں اور ان سے وابستہ شخصیات کے فکر و فن کی مظہر ہیں۔

"ادبیات و شخصیات" ان کتابوں جتنی معروف نہیں ہوئی شاید ہی کسی ناقد نے بھی بطور خاص اس کتاب کا تذکرہ کیا یا حوالہ دیا ہو۔ اسی لیے میں نے اسے مطالعہ کے لیے منتخب کیا اور

اس وجہ سے بھی کہ یہ ادب و نقد کے مسائل سے بحث نہیں کرتی بلکہ ادب و نقد کا مرکز بننے والی عہد ساز اور رجحان ساز شخصیات کے بارے میں ہے، جو ہماری ادبی اور تہذیبی تاریخ میں ممتاز مقام کی حامل ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا حسرت موہانی، علامہ نیاز فتح پوری، مولانا حامد حسن قادری، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، پروفیسر حمید احمد خاں، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، پروفیسر سید عابد علی عابد، ڈاکٹر محمود حسین خاں، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ اسی انداز و اسلوب کے کچھ اور بھی مضامین ملتے ہیں:

"میرزا ادیب۔ ایک زندہ جاوید افسانہ نگار" مشمولہ "میرزا ادیب: شخصیت و فن"

مرتبہ: رشید امجد۔ لاہور: ۱۹۹۱ء

"ترقی پسند تحریک اور پروفیسر احتشام حسین" مجلّہ "ارتقا" کراچی۔

احتشام حسین نمبر ۱۹۹۳ء نیز مشمولہ: "پاکستانی ادب: ۱۹۹۳ء

حصہ نثر مرتبین: ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر رشید امجد، اسلام آباد ۱۹۹۵ء

"محمد عبداللہ قریشی کی شخصیت اور ادبی خدمات کے بعض پہلو"

مجلّہ "اقبال" لاہور جولائی اکتوبر ۱۹۹۰ء

بلکہ میں تو ڈاکٹر صاحب کے "آتش لکھنوی" (مشمولہ: پاکستانی ادب ۱۹۹۲ء حصہ نثر

"مرتبین: خالدہ حسین، ڈاکٹر سلیم اختر) اسلام آباد ۱۹۹۳ء کو بھی اسی فہرست میں شامل کرنے کو تیار ہوں، اس امر کے باوجود کہ آتش اور فرمان دوست یا ہم عصر نہ تھے۔ یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب کے بعض دیباچوں کا بھی اس سلسلہ میں تذکرہ کیا جا سکتا ہے، جیسے ڈاکٹر طاہر تونسوی کی کتاب "تحقیق و تنقید: منظر نامہ" (لاہور: ۱۹۹۵ء) کا دیباچہ اب اتفاقاً ڈاکٹر صاحب کے دیباچوں کا ذکر چھڑ گیا تو میں یہ کہتا ہوں کہ "کتاب سے پہلے" کی مانند ان کے دیباچوں کا بھی ایک مجموعہ مع تنقیدی مقدمہ مرتب ہونا چاہیے۔

دیباچہ نگاری اور فلیپ نگاری نے اب ایک فن شریف کی صورت اختیار کر لی ہے۔

مصنفین دیباچہ اور فلیپ سے اپنا ادبی قد اونچا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خیال خاطر احباب کی خاطر مرصع دیباچے قلم بند کیے جاتے ہیں اور ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے پُر بہار فلیپ لکھے جاتے ہیں۔ ایسے دیباچے اور فلیپ جو موضوع سے دور مگر صاحب کتاب کے قریب ہوتے ہیں۔ ہمارے صورت آشنا معاشرہ میں دوستانہ تعلقات یا تعلقات عامہ کی خاطر ایسے ادبی سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ اسی لیے بیشتر صورتوں میں دیباچے اور فلیپ تنقیدی زکوٰۃ ثابت ہوتے ہیں مگر ڈاکٹر فرمان فتح پوری مستثنیات میں سے ہیں۔ اسی لیے ان کے دیباچے رسمی اور محض مدلل مداحی نہیں ہوتے بلکہ وہ دیانت داری سے کتاب کا محاکمہ کرتے ہیں لہٰذا دیباچوں پر مشتمل کتاب ڈاکٹر صاحب کے انداز نقد کے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالے گی جو دیباچوں سے مشروط سمجھا جاتا ہے بلکہ اس مقصد کے لیے میں تین مرتبین کے نام بھی تجویز کیے دیتا ہوں۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ڈاکٹر طاہر تونسوی اور ڈاکٹر نجیب جمال۔

جہاں تک ''ادبیات و شخصیات'' پر قلم بند کیے گئے مضامین کا تعلق ہے تو یہ خاکے نہیں ہیں، جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ خاکہ نگاری کے لیے فقرہ بازی پر مبنی جس چلبلے اسلوب کی ضرورت ہے، ڈاکٹر صاحب کی متمدن متانت سے بعید ہے۔ مزید برآں خاکہ میں شخصیت کا جس طرح سے پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے وہ بھی ڈاکٹر صاحب کا شعار نہیں۔ ڈاکٹر صاحب تو بے تکلف دوستوں کی محفل میں بھی کسی غیر حاضر شخص کے لیے بدزیب فقرہ نہیں کہتے تو انہوں نے خاکہ نگاری کے لیے کردار کی خامیاں، اطوار کی بوالعجبیاں، انداز کی خرابیاں اور ذات کے پھوڑے کہاں سے تلاش کرنے ہیں۔

موضوع بننے والی علمی ادبی شخصیات ہیں اور ان کے اسی پہلو کو اُجاگر کیا گیا ہے اس پر مستزاد یہ امر کہ خود ڈاکٹر فرمان صاحب بھی ان سے بے حد مرغوب ہیں اسی لیے ذاتی تعلقات کے باوجود بھی انہوں نے قلم کو ادھر اُدھر منہ مارنے کی اجازت نہ دی۔ وہ خود بھی لکھتے ہیں:

''۔۔۔ایسی اہم و عظیم شخصیات کے سوانح، علمی و ادبی خدمات کو موضوع گفتگو بنایا

گیا ہے جنہوں نے اردو کے تعلیمی و ادبی، علمی و فکری اور ثقافتی و تہذیبی افق پر لازوال نشانات یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کی زندگی اور ان کے چھوڑے ہوئے سرمایہ نے بیسویں صدی کے اردو ادب اور ادیبوں پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ اتنا گہرا کہ آج ہم اردو زبان و ادب کے خواہ کسی پہلو پر بھی قلم اٹھائیں یا بحث کریں، کسی نہ کسی نہج سے ان شخصیات کا تذکرہ ناگزیر ہو جائے گا۔ ان کی رہنمائیاں وقتی نہیں دائمی ہیں اور ان کے فیضان سے صرف ہم اور آپ نہیں آئندہ نسلیں بھی تا دیر مستفیض ہوتی رہیں گی۔ ان میں مذکور شخصیات میں سے ہر ایک کا قد و قامت بہ اعتبار فکر و نظر اور علم و فن اتنا بڑا ہے کہ میں ان کی ہم سری و ہم عصری کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ عمر میں بھی یہ مجھ سے اتنے بڑے تھے کہ میرا شمار ان کے بعد کی دوسری، تیسری نسل میں ہونا چاہیے۔۔۔'' (ص:۱۹)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری آج خود اردو ادب کے بڑوں میں شمار ہوتے ہیں۔ بحیثیت معلم، محقق اور ناقد کئی نسلوں کی ذہنی تربیت میں مثبت کردار ادا کیا اور ہنوز فعال ہیں مگر بزرگوں کے احترام کا یہ عالم کہ خود کو ''خورد'' بنالیا؟ لکھتے ہیں:

''یہ بات میرے لیے محض یادگار نہیں بلکہ باعث مسرت و افتخار ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو میں نے دیکھا ہے، ہر ایک سے ملا ہوں، ہر ایک سے باتیں کی ہیں، ہر ایک کی باتیں اپنے کانوں سے سنی ہیں، ہر ایک سے میرے نیاز مندانہ روابط رہے ہیں اور ہر ایک نے صرف میرے ذہن پر ہی نہیں بلکہ میری عمر کے سارے ذہنوں پر زبان و ادب، تعلیم و تاریخ، ثقافت و تہذیب اور علم و فن کے حوالے سے بہت گہرے نقوش یادگار چھوڑے ہیں اتنے گہرے کہ اگر ہم انہیں بھلانا بھی چاہیں تو بھلا نہیں سکتے۔'' (ص:۷)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے اس روّیے کے بارے میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں:

عشق بن یہ ادب نہیں آتا

لیکن یہ مضامین بالادب بالاحظہ ہوشیار قسم کے نہیں ہیں، ہر چند کہ ڈاکٹر صاحب نے خود بھی انہیں "تحقیقی وتنقیدی نوعیت" کے قرار دیا مگر یہ مضامین ان معنی میں تحقیقی اور تنقیدی نہیں جیسے ان کی کتاب "تحقیق وتنقید" میں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان صاحب کے سب شخصیات سے تعلقات یا دوستانہ مراسم تھے اسی لیے سب کے تذکرہ میں ذاتی حوالوں اور ان پرمبنی تاثرات سے رنگ چوکھا ہوتا ہے۔ یوں بہت سی ایسی باتیں، معلومات اور کوائف بھی شامل ہو گئے ہیں جو شخصی تعلقات ہی کی بدولت ممکن تھے، اس لیے یہ مضامین تحقیقی اور تنقیدی مواد کے حامل ہونے کے باوجود شخصیت نگاری قرار پاتے ہیں اور یہی جواز ہے انہیں جداگانہ کتاب کی صورت میں طبع کرنے کا۔

ڈاکٹر صاحب نے محبت، احترام اور عقیدت کی روشنائی میں قلم ڈبو کر یہ مضامین قلم بند کیے اور ان کا اسی روشنی میں مطالعہ ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر فرمان، منٹو اور عصمت کے اسلوب میں خاکہ نہ لکھ سکتے تھے۔ ورنہ مولوی عبدالحق کا خاکہ کچھ اور طرح کا ہوتا اور عابد علی عابد کے بارے میں اور طرح کے کوائف جمع کیے ہوتے اور محض یہ نہ لکھا ہوتا

"۔۔۔ مجھے ان کے بارے میں بعض ایسی باتوں کا علم ہو سکا ہے جو ان کی
کتابوں کے مطالعہ سے نہ معلوم ہو سکتی تھیں۔" (ص:۱۶۹)

انسانی شخصیت بالعموم اور عظیم شخصیات کو بالخصوص آئس برگ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ آئس برگ کی چوٹی نظروں کے سامنے روشنی میں ہوتی ہے جبکہ بقیہ حصہ آبی نقاب اوڑھے زیرِ آب ہوتا ہے اور صرف نفسیات ہی ایسا علم ہے جس کی مدد سے بھید بھری انسانی سائیکی کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایسا کر سکتے تو ان اہم ادبی شخصیات کا "3-D" مطالعہ ہو جاتا لیکن ڈاکٹر صاحب کے ادبی مقاصد میں ایسا مطالعہ شامل ہی نہ تھا اس لیے اس کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔

ایک جدت البتہ یہی ہے کہ فہرست میں ہر شخصیت کی اساسی صفات بیان کر دی ہیں۔ یوں ایک نگاہ میں وجۂ شہرت کا علم ہو جاتا ہے۔

- ڈاکٹر مولوی عبدالحق - محقق، نقاد، مبصر، قومی زبان کا حلیف و نقیب
- مولانا حسرت موہانی صاحب کردار، بے باک، درویش، تہذیب عاشقی کا شاعر
- علامہ نیاز فتح پوری - عالم، دانشور، بے لاگ ناقد، حریت فکر و قلم کا علم بردار
- مولانا حامد حسن قادری- زبان شناس، سخن فہم، شارح و تاریخ گو، غالب شناس
- ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی: سائنسدان، مصور، شاعر، مشرقی روایات کے ترجمان
- پروفیسر حمید احمد خاں - پیکر علم و عمل، نکتہ رس، نسخۂ حمیدیہ کا مرتب، غالب شناس
- پروفیسر مجنوں گورکھپوری - افسانہ نویس، نقاد، عالم زبان، رفیق نیاز و نگار
- پروفیسر سید عابد علی عابد - شاعر، معلم، زبان دان، مشرقی شعریات کا نباض
- ڈاکٹر محمود حسین خاں، مورخ، ماہر تعلیم، قدر دان علم و ادب، مشرقی اقدار کا پاسدار
- ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری- ہفت زبان، افسانہ نگار، ناقد، ترقی پسند ادب کا محرک اول

اگر اسی انداز پر میں بھی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شخصیت اور علم و فن کے بارے میں اساسی خصوصیات بیان کروں تو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا سمندر کچھ اس طرح کے کوزہ میں بند ہوگا:

- ڈاکٹر فرمان فتح پوری- ژرف بین، محقق، معتدل مزاج، نقاد، مقبول معلم، روشن خیال مفکر، خوش مزاج مردِ شریف، حلقۂ نیاز و نگار کی روح رواں۔

میر کو سمجھنے کے لیے

اگرچہ علامہ اقبال اور مرزا غالب کے مقابلہ میں اُردو تنقید میں میر تقی میر پر بہت زیادہ نہ لکھا گیا لیکن ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ بعض بہت اچھے شعرا، جیسے ولی، مصحفی، آتش، مومن کی مانند میر پر اتنا نہ لکھا گیا، جتنا اس کا حق بنتا تھا۔ ہر چند اس وقت میر تقی میر کی کتابیات مرتب کرنا مقصود نہیں، تاہم اس امر پر یقیناً زور دیا جا سکتا ہے کہ تمام تذکرہ نگاروں نے میر کو سراہا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں میر کا ٹھیک ٹھاک تذکرہ بھی کیا اور ان کی ''کم دماغی'' کا ڈراما بھی دکھایا۔ آزاد کے بعد مولوی عبدالحق ''کلیات میر، ۱۹۴۱ء'' کے مرتب، عبدالباری آسی، ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر سید عبداللہ، شمس الرحمٰن فاروقی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی جیسے محققین اور ناقدین کے اسما ہیں اور ان پر مستزاد لاتعداد وہ مقامات جو وقتاً فوقتاً لکھے جاتے رہے ہیں۔

اگرچہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری خود کو غالب پرست کہتے ہیں لیکن انھوں نے غالب پرستی کو اندھے کی لاٹھی نہ بنالیا۔ چنانچہ ایک کشادہ ذہن ناقد ہونے کے ناطے انھوں نے دیگر شعراء کو بھی سراہا۔ سرفہرست علامہ اقبال ہیں، پھر میر انیس، مرزا شوق اور حسرت موہانی پر باضابطہ کتابیں ہیں اور متعدد معاصرین پر تنقیدی و تحقیقی مقالات لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان شخصیات پر خامہ فرسائی کرتے وقت ذہن کے کسی گوشہ میں میر تقی میر بھی ''مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں'' کے مصداق فرمان صاحب کو اپنے ریختہ کی طرف توجہ دلاتے رہے، یہ کہہ کر:

ریختہ رتبہ کو پہونچایا ہوا اس کا ہے
معتقد کون نہیں میرؔ کی استادی کا

چنانچہ فرمان فتح پوری ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ:

''غالب، انیس اور اقبال کے بارے میں جی بھر کے پڑھنے اور کام کرنے

کے ساتھ ساتھ میرا ذہن میر کی شخصیت اور فکر و فن کے تعاقب میں لگا رہا۔ ''مقدمہ انتخاب میر'' مرتبہ مولوی عبدالحق کی معرفت چونکہ میں بہت پہلے غزل کے حوالے سے میر کی میری کا قائل ہو چکا تھا اور ان کے تذکرہ شعرا و مثنویات کا بھی بالاستیعاب مطالعہ کر چکا تھا اس لیے کسی نہ کسی نہج سے میرؔ کو برابر پڑھتا رہا۔۔۔۔ وہ سب کچھ دیکھنے کی کوشش کی جو پچھلے پچاس برسوں میں میرؔ کے بارے میں شائع ہوا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی مجھے سیری نہیں ہوئی اور ایسا ہونا تو کوئی ضروری نہیں تھا، اس لیے کہ ہر لکھنے والا واقعات سے نتائج اخذ کرنے اور کسی شاعر کے فکر و فن کے بارے میں رائے قائم کرنے میں آزاد ہوتا ہے اور آخر میں اپنی ذاتی پسند و ناپسند کے مطابق ہی فیصلے سناتا ہے۔'' (ص ۷)

تلاش میر کے سلسلہ میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے جو ذہنی مراحل طے کیے ان کا حاصل تازہ ترین کتاب ''میر کو سمجھنے کے لیے، (شخصیت و شاعری کا مطالعہ) ہے۔ بیالیس اُردو اور دو انگریزی کتابوں کے بعد طبع ہونے والی یہ کتاب بلحاظ تدبیر کاری جداگانہ ہے۔ مروجہ انداز کے مطابق میر کی شخصیت اور شاعری کا مجموعی مطالعہ ہونے کے برعکس یہ کتاب ان اساسی ماخذ پر روشنی ڈالتی ہے، جو مطالعہ میر میں بنیادی اہمیت کے حامل قرار پاتے ہیں۔ یعنی تذکرۂ نکات الشعراء، ذکر میر اور مثنویات۔ بالفاظ دیگر ڈاکٹر فرمان صاحب کے بموجب ان تینوں کے مطالعہ سے وہ تناظر تشکیل پاتا ہے جس میں میر کی شخصیت اور شاعری کا مطالعہ سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اپنے موقف کی وہ ان الفاظ میں وضاحت کرتے ہیں:

''قارئین اور دوسرے ناقدین و محققین کی رائے خواہ کچھ بھی ہو، میرے مطالعہ کا حاصل یہ ہے کہ میر کی سیرت اور شخصیت اور کلام کو سمجھنے کے لیے جہاں ان کی غزلیات کا مطالعہ کرنا چاہیے، وہاں ان کی مثنویات اور

تذکروں یعنی ''نکات الشعراء'' اور ''ذکر میر'' کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے بلکہ اولاً ان ہی پر بھرپور توجہ دینی چاہیے اور ان کے مطالعے کی روشنی میں میر کی عشقیہ شاعری کو بھی جانچنا پرکھنا چاہیے۔'' (ص:۹)

۲۲۲ صفحات کی کتاب میں مطالعہ میر ان ابواب پر مشتمل ہے: ''مطالعہ میر کے بنیادی ماخذ۔'' ''میر بحیثیت تذکرہ نگار۔'' ''میر اپنی مثنویات کی روشنی میں'' ''میر کا عشق اور ان کی عشقیہ شاعری۔'' ''میر کے مختصر سوانحی کوائف۔'' ''مقدمہ کلیات میر''، مرتب: عبدالباری آسی، مطبوعہ ۱۹۴۱ء بطور ضمیمہ۔ کتاب کا باب اول یعنی ''مطالعہ میر کے بنیادی ماخذ۔'' دراصل اسی بنیادی کی حیثیت رکھتا ہے، جس پر ڈاکٹر فرمان صاحب نے میر شناسی کی اپنی عمارت استوار کی ہے۔ انہوں نے ''کتاب سے پہلے'' جو لکھا اس کی توثیق اسی باب کے آغاز میں یہ لکھ کر کی:

''میر کے بارے میں وثوق سے کچھ جاننے اور ان کے فکر و فن کے بارے میں رائے قائم کرنے کے بنیادی ماخذ صرف چند ہیں۔ ان میں ''کلیات میر''، ''نکات الشعرا'' اور ''ذکر میر'' کو اولیت حاصل ہے۔ بعدہ محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' سے لے کر شمس الرحمن فاروقی تک جتنی تحریریں مشمولہ دلی کالج میگزین میر تقی میر نمبر اور ''نقوش'' لاہور ''میر تقی میر نمبر'' سامنے آئے ہیں۔ ان میں اردو شعراء کے قدیم تذکروں کے بعد صرف دو ''مقدمہ کلیات میر'' از عبدالباری آسی بطور نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۴۱ء اور ''میر تقی میر، حیات اور شاعری'' از خواجہ احمد فاروقی، انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۵۴ء ایسے ماخذ ہیں، جنہیں بنیادی کہا جا سکتا ہے۔'' (ص:۱۴)

مندرجہ بالا اقتباس کی دوگونہ اہمیت ہے۔ ایک تو اس سے ڈاکٹر صاحب کی میر فہمی کی فکر اساس کا تعین ہو جاتا ہے اور دوسرے ناقدین، ادبی مورخین، ادب کے اساتذہ اور مطالعہ میر کے سنجیدہ طلبہ کو اس سے راہنمائی بھی ہو جاتی ہے۔ اساسی ماخذ سے صرف نظر کے بعد مطالعہ میر اگر غلط نہ بھی ہو تو ''بے بنیاد'' ہونے کی وجہ سے ''بے سمت'' یقیناً ہو سکتا ہے۔ لہٰذا جب ڈاکٹر

فرمان صاحب ''میر کو سمجھنے کے لیے'' کتاب کا نام رکھتے ہیں تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔

میر (بلکہ کسی بھی شاعر) پر خامہ فرسائی کرنے والا ناقد بالعموم حالات زیست اور شاعری کے متوازی مطالعہ سے فکر و فن، تصور زیست، حسن خیال اور اسلوب کی جمالیات سے متعلق امور اجاگر کرتا ہے اور اس ضمن میں اساسی ماخذ، ثانوی ماخذ اور اسی نوع کے مصدقہ (بعض اوقات غیر مصدقہ) مواد پر انحصار کرتا ہے مگر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مروج رویہ کے برعکس انداز اپنا کر میر فہمی کے ضمن میں اساسی ماخذ کا تعین کرتے ہوئے تحقیق کے محدب شیشہ میں رکھ کر ان کے تجزیاتی مطالعہ کی روشنی میں میر کی شخصیت، شاعری، اسلوب اور تصور حیات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اگرچہ انہوں نے میر کے سلسلہ میں کوئی نئی، انوکھی یا چونکا دینے والی بات نہیں کی، لیکن طریق نقد کی تبدیلی کے باعث نیا پن ضرور پیدا ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اساسی ماخذ کی روشنی میں میر فہمی کے ضمن میں جو نکات اُجاگر کیے، ان کا خلاصہ ان کے الفاظ میں پیش ہے:

''سر دست میر سے تذکرہ نگاری کی اولیت کا شرف چھیننا ان کے ساتھ زیادتی ہے۔'' (ص:۳۷)

''یہ خیال صحیح ہے کہ میر تقی میر نے شعرا کے متعلق بے لاگ آرائیں ہیں۔ ان کی رائے سے ہم اختلاف کریں یا اتفاق، اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ وہ شاعری کے ساتھ ساتھ تنقید کا بھی اچھا شعور رکھتے ہیں۔ ان کے لسانی اور تنقیدی شعور کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے تذکرے کے آخر میں ریختہ اور اس کی اقسام کی تعریف کرتے ہوئے فن شعر کے معیار کا تعین کرنے کی کوشش کی۔'' (ص:۴۱)

''میر اردو شاعری کے پہلے ناقد ہیں، جن کے یہاں عملی تنقید سے الگ نظری تنقید کے سلسلے میں بھی بعض اصولوں اور رائیوں کی نشاندہی ملتی

ہے۔" (ص:۳۲)

"وہ ایک عظیم غزل گو ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ممتاز مثنوی نگار بھی ہیں۔ چنانچہ ان کی بیشتر مثنویاں حسنِ بیان اور تاثر کے لحاظ سے غزل جیسی ہیں بلکہ ان مثنویوں میں ایک وصف ایسا ہے جو انہیں غزلوں سے زیادہ اہم بنا دیتا ہے۔ اس وصف کا تعلق میر کی سیرت و شخصیت کے اس پہلو سے ہے جو غزلوں میں اتنا نمایاں نہیں، جتنا کہ مثنویوں میں ہے۔" (ص:۴۷)

"تنقیدی پہلو سے قطع نظر سوانحی و تاریخی اعتبار سے "نکات الشعرا" کی اہمیت مسلم ہے۔" (ص:۴۳)

"میر نے اپنے عشق کا بیان اپنی تین مثنویوں موسوم بہ "معاملاتِ عشق" "جوشِ عشق۔" اور "خواب وخیال" میں کیا ہے۔" (ص:۱۱۴)

"ان کی شخصی مثنویوں میں جس قسم کی محبت کا ذکر ملتا ہے، اس کا تعلق ہم جنس سے نہیں بلکہ صنفِ نازک سے ہے۔۔۔۔ مثنویوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی محبت غیر فطری نہیں بلکہ فطری تھی۔" (ص:۱۱۹)

"مثنویوں میں بیان کردہ میر کی یہ عشقیہ رُودادیں ان کی عاشقانہ غزل کے مطالعے میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔" (ص:۱۳۳)

"میر اور میر کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ان کی مثنویوں خصوصاً ان کی سوانحی مثنویوں کا مطالعہ از بس ضروری ہو جاتا ہے۔" (ص:۱۳۴)

"بات غمِ جاناں کی ہو یا غمِ زمانہ کی، میر نے یورشِ آلام کے باوجود ہر جگہ ایک طرح کا توازن برقرار رکھا ہے۔۔۔ یورشِ غم نے انہیں افسردہ دل شکستہ کرنے سے کہیں زیادہ پُر اعتماد اور دوسروں کا غمگسار بنا دیا ہے چنانچہ ان کے کلام پر جتنا نمایاں اثر انسان دوستی، انسانیت پرستی اور دنیا و اہلِ دنیا

کی غم خواری اور دلنوازی کا ہے، اتنا غم زدگی و غمناکی یا حزن و ملال کا نہیں ہے۔" (ص:۱۳۵)

"اچھے اشعار اور اچھی غزلوں میں فارسی ترکیبیں، مشکل الفاظ، پیچیدہ لغات، دور از کار استعارات و ابہام یا ایہام کی صنعت بھی کہیں نہ ملے گی۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ عظمتِ شاعرانہ کے اعتبار سے غالب، اقبال و انیس کے ہم مرتبہ ہیں لیکن ان کے اشعار کو نہ کسی لغت کی ضرورت ہے نہ فرہنگ کی۔ جو پڑھتا یا سنتا ہے واقعی سر دھنتا ہے۔" (ص:۱۴۹)

"موضوع و مواد اور طرزِ سخن کے حوالے سے میر کی عشقیہ شاعری کے جن رموز و نکات کا ذکر اجمال کے ساتھ کیا گیا، وہی میر اور میر کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں اور انہی کی بدولت انہیں اپنے عہد سے لے کر آج تک غیر معمولی مقبولیت حاصل رہی ہے۔" (ص:۱۵۵)

کیا یہ پیوست اقتباسات میر پر ایک مختصر مضمون کی صورت نہیں اختیار کر لیتے؟

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی سوا دو سو صفحات پر مشتمل کتاب "میر کو سمجھنے کے لیے" میر فہمی کے طویل سلسلے سے متعلق تازہ ترین کوشش کی بنا پر قابلِ مطالعہ ہے بلکہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ قابلِ توجہ کہ یہ کام فرمان فتح پوری صاحب کی اوائل عمر یا ابتدائے نقد کا ہونے کے برعکس عہدِ پختہ کاری کا ہے۔ میر سادہ اسلوب میں دردِ دل کی کہانی ہی کہتا ہے مگر اس کی سادگی سپاٹ اسلوب والی بے نمک سادگی نہیں، یہ وہ سادگی ہے جو زیور کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس لیے میر فہمی کے لیے شعر فہمی کے ساتھ حسنِ نقد اور اسلوب کی جمالیات کا ادراک ضروری ہے اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا قلم ان ہی سے مالا مال ہے۔

میر تقی میرؔ نے کہا تھا:

تربت میرؔ پہ ہیں اہل سخن
ہر طرف حرف ہے حکایت ہے
تو بھی تقریب فاتحہ سے چل
بخدا واجب الزیارت ہے

اہل سخن کے ساتھ ساتھ اہل نقد کا بھی تربت میرؔ پر اجتماع ہے۔ آج سے نہیں، گزشتہ دو صدیوں سے اور اس اجتماع میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری بھی شامل ہیں، اپنی کتاب 'میرؔ کو سمجھنے کے لیے' بغل میں داب ے۔

⑨ ہم کو شاعر نہ کہو

ہم میں راہ سخن نکلی تھی
شعر ہوتا ترا شعار اے کاش

میر تقی میرؔ نے اپنے شعر نا آشنا محبوب کے بارے میں یہ کہا تھا۔ ادھر آج کے میر تقی میرؔ، ناقدین پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ شعر سے کورے نقاد، شاعر کے تخلیقی کرب کو کیا جانیں؟ لہٰذا انہیں شعر اور شاعر کے بارے میں گفتگو کا حق نہیں۔ میں اس بحث میں نہیں الجھتا کہ کتنے شاعر خود بھی شعر نافہم ہیں اور کتنے اچھے نقاد اچھے شاعر بھی ہیں کہ مقصد اس وقت ڈاکٹر فرمان صاحب کی شاعرانہ حیثیت کو نمایاں کرنا ہے۔ جی ہاں! یہ محقق اور نقاد ٹھیک ٹھاک قسم کا شاعر بھی رہا ہے۔ یہ الگ بات کہ عام روش کے برعکس انہوں نے شاعری کو ذریعہ عزت نہ جانا اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ مشاعروں کی سیاست میں ملوث نہ ہونے کی بنا پر جب یہ مشاعروں میں جاتے تو واپسی پر کڑھتے کہ مجھے میرے مقام پر نہ پڑھایا گیا۔

صدی پون صدی قبل کے دہلی لکھنو اور یوپی کے دیگر شہروں میں اکھاڑا اور مشاعرہ لازمہ ثقافت تھے یہی نہیں بلکہ ان کی اپنی ثقافت بھی تھی۔ شرفا کے بچے جسمانی ورزشوں اور شعر و شاعری سے یکساں شغف کا اظہار کرتے تھے چنانچہ دلدار میاں بھی بچپن کی یادوں میں یہ لکھ چکے ہیں کہ بانک، بنوٹ، کشتی کے ساتھ ساتھ وہ شاعری میں بھی نمایاں تھے۔ وہ اس ضمن میں مزید رقم طراز ہیں:

میرا یہ مشغلہ بہت دنوں قائم رہا اور ہائی اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں جہاں میں نے بیت بازی اور فی البدیہہ مباحثے کے درجنوں مقابلے جیتے اور مولانا حسرت موہانی و جگر مرادآبادی جیسے بڑے شاعروں کے ہاتھ سے انعامات حاصل کیے وہیں میں نے فتح پور کے ضلعی ٹورنامنٹ میں کشتی کا پہلا انعام بھی ضلع کے کلکٹر جناب زاہد حسین صاحب کے ہاتھوں وصول کیا

یہ وہی زاہد حسین تھے جو بعد کو پاکستان میں اسٹیٹ بنک کے پہلے گورنر مقرر ہوئے۔

ابتدائی شاعری کے ایک دو واقعات اور یاد ہیں۔ پرائمری اور مڈل اسکول میں بلکہ اپنے گاؤں اور قصبے میں لڑکوں اور طالب علموں کے درمیان مختلف وجوہ سے گروہ بندی رہتی تھی۔ اس گروہ بندی کے نتیجے میں کسی خاص لڑکے کا بائیکاٹ کر دیا جاتا تھا یعنی اس کے ساتھ بول چال بند رہتی تھی اور اس پر طرح طرح سے فقرے اور آوازے کسے جاتے تھے۔ ایسے موقعوں پر میں شاعری سے بھی کام لیتا تھا چنانچہ رام شنکر نام کے ایک ہندو لڑکے کے بائیکاٹ پر میں نے یہ شعر کہا:

ایک لڑکا گاؤں کا عرصے سے بائیکاٹ ہے

نام اس کا "ر" سے ہے چغلی میں موٹر کاٹ ہے

موٹر کاٹ سے مراد موٹر کار تھی۔ اس شعر کے حرف "ر" کو کسی اور حرف سے بدل کر ضرورت کے مطابق کسی دوسرے طالب علم کے لیے بھی موزوں کر لیا جاتا تھا۔

فرمان کا جنم

چھٹی جماعت کا ایک اور اہم واقعہ یاد آ گیا اور یہ شاید میرے لڑکپن کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ پرائمری اسکول سے مڈل اسکول تک میرے دو چچا زاد بھائی بھی میرے ہم جماعت رہے۔ ان میں ایک سید فرمان علی تھے جس سے میری پکی دوستی تھی۔ اتنی پکی کہ ہم لوگوں نے جب سے ہوش سنبھالا تقریباً ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ مڈل اسکول گھر سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ میرے پاس سائیکل تھی۔ ہم دونوں اسی پر جاتے تھے۔

ایک دن صبح سویرے جب میں فرمان کے دروازے پر پہنچا اور اسکول چلنے کے لیے آواز دی تو چچی جان نے بتایا:

"ابھی وہ بڑے تالاب سے نہا کر آئے تھے، بہت تیز بخار چڑھ گیا ہے۔ بخار اتر گیا تو وہ کسی کے ساتھ آ جائیں گے، تم جاؤ ماسٹر صاحب سے حال

بتا دینا اور فرمان نہ پہنچیں تو چھٹی کی درخواست لگا دینا۔"

مجھے اسکول پہنچے ہوئے مشکل سے دو گھنٹے گزرے تھے کہ گاؤں کا ایک باسی ہانپتا کانپتا یہ منحوس خبر لایا کہ فرمان میاں کا انتقال ہو گیا۔ اس اچانک خبر سے سارے عزیزوں اور دوستوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ فرمان میرے عزیز ترین دوست تھے۔ لنگوٹیا یار تھے بچپن ہی سے ہر جگہ اور ہر دکھ سکھ میں ہم دونوں ساتھ رہتے تھے، میرے لیے ان کی وفات بڑی جان لیوا تھی۔ کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ الٹی سیدھی شاعری تو کر ہی لیتا تھا۔ اس لیے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ایک نظم بھی کہی تھی لیکن اب یاد نہیں رہی۔ البتہ میں نے یہ کیا کہ اپنے نام کے ساتھ ان کے نام کو تخلص کے طور پر لگا لیا۔ گویا میرا تخلص فرمان ہو گیا اچھے برے جتنے بھی اشعار کہتا، سب میں "فرمان" کو بطور تخلص استعمال کر کے دل خوش کرتا تھا۔ پھر مضامین وغیرہ میں بھی اسی نام کو استعمال کرنے لگا۔ ۱۹۳۶ء میں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اس وقت سے "فرمان" میرے نام کا جزو بن گیا۔ لوگ میرا اصل نام بھول گئے اور سب اسی نام سے پکارنے لگے۔ میں خوش ہوں کہ میرے ساتھ ساتھ میرا دوست بھی زندہ ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے اب صرف وہی زندہ ہے، میرا نام تو کوئی جانتا بھی نہیں۔"(۱۱)

شاعری اور شعور

ڈاکٹر صاحب نے خان ظفر افغانی کو انٹرویو دیتے ہوئے باقاعدگی سے شاعر نہ کرنے کی وجہ بتائی:

"میں نے شاعری اس لیے ترک کر دی کہ شاعری اور شعور ساتھ ساتھ ہیں۔ میرا مطالعہ نثر کے مقابلے میں شاعری میں بہت زیادہ ہے۔ دیوان غالب پورا بچپن ہی میں یاد ہو گیا تھا۔ شعور شاعری کے معیار مقرر کر دیتا ہے۔ اب بھی نظمیں غزلیں کہتا ہوں لیکن سب بے کار ہے۔ میں انہیں اس قابل نہیں سمجھتا کہ چھاپوں، بس یہ ہے کہ شعر آ رہا ہے آنے دو، ترغیب

سے نہیں کہتا۔" (۱۲)

منظر امکانی کے ساتھ مکالمہ میں مزید بتایا:

"۔۔۔علامہ نیاز نے بھی مجھے مشورہ دیا کہ میں شاعری ترک کر کے مضامین لکھوں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خود علامہ نیاز بھی شاعری ترک کر چکے تھے۔"

ڈاکٹر صاحب نے مزید بتایا۔

"۔۔۔میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا، اب بھی شعر کہتا ہوں، یہ بات شاید آپ کے علم میں نہ ہو کہ میں بہت تیز شعر لکھتا ہوں، کسی بھی موضوع پر ابھی نظم لکھ سکتا ہوں۔۔۔ شاعری میرا ذاتی معاملہ ہے اس لیے صرف میں خوش ہوتا ہوں، اپنی خوشی کی تکمیل تو شعر لکھ کر ہو جاتی ہے۔" (۱۳)

فرمان صاحب کے احباب اور خود فرمان صاحب نے بھی اپنی ریاضی دانی کا جو تذکرہ کیا تو یہ میرے لیے بطور خاص تعجب خیز ہے۔ اس لیے کہ قیام پاکستان سے قبل کے ہندوستان میں یہ مشہور تھا کہ مسلمان ریاضی میں کورے ہوتے ہیں۔ میں ریاضی دانی کو محض جمع تفریق سمجھنے کے برعکس انداز زیست سمجھتا ہوں، اسی لیے علامہ اقبال کو بھی سود و زیاں اور ظن و تخمین ناپسند تھے اور وہ ان پر انحصار کرنے والی عقل سے الرجک تھے۔ فرمان صاحب جامع تضادات معلوم ہوتے ہیں۔ جسمانی ورزش اور ریاضی دانی کے ساتھ فارسی اساتذہ کے اشعار اور دیوان غالب کا ازبر ہونا، پھر شاعری اور اس کے ساتھ تحقیق و تنقید اور پرجوش خطابت۔ یہ میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ ان میں سے کسی ایک میں بھی کمال پیدا کرنے کے لیے چراغ زیست میں خاصی مقدار میں تیل جلانا پڑتا ہے مگر فطرت فرمان صاحب پر خاصی مہربان رہی ہے کہ صلاحیتوں کی عنایت میں بخل سے کام نہ لیا۔

فرینکفرٹ (جرمنی) میں مقیم ان کے بچپن کے دوست ڈاکٹر شباہت علی خاں نے "نصف صدی کا قصہ" طویل خط کا ایک حصہ میں بچپن کی منفرد یادوں کے ساتھ دلدار میاں کی ریاضی دانی اور شاعری کے بارے میں دلچسپ معلومات ہم پہنچائی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"فرمان صاحب کو اردو و ریاضی سے یکساں دلچسپی تھی۔ دونوں میں ہمیشہ ان کو امتیازی نشانات ملتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میٹرک تک ریاضی کے پرچوں میں جہاں وہ لکھا ہوتا کہ "کوئی سے پانچ سوالات حل کیجیے" انھوں نے سارے سوالات حل کیے اور کاپی کے اوپر لکھ دیا کہ "کوئی سے پانچ جوابات دیکھ لیجیے۔" میٹرک کرنے کے بعد جب وہ اسی اسکول میں ماسٹر ہو گئے تو بھی نویں اور دسویں جماعت کو حساب ہی پڑھاتے تھے۔ حساب کے بعد اگر کوئی مضمون ان کو پڑھانے کو بطور خاص دیا جاتا تھا تو وہ انگلش گرامر اور ٹرانسلیشن کا پرچہ تھا۔ انگریزی اور حساب پڑھانے کی وجہ سے اسکول میں ان کی خاصی اہمیت تھی۔ ہم چونکہ ایک ہی گھر میں ساتھ رہتے تھے اس لیے یاد ہے کہ فتح پور کے روسا کے بہت سے لڑکے ان سے ٹیوشن پڑھنے آتے تھے بعض کو وہ معاوضے کے ساتھ اور بعض کو مفت پڑھاتے تھے۔" (۱۴)

وہ شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"معلوم نہیں آپ کے ڈاکٹر صاحب اب شعر کہتے ہیں یا نہیں لیکن چند سال پہلے ضرور کہتے تھے، اس لیے کہ مجھے انھوں نے کچھ نظمیں بھیجی تھیں۔ ایک زمانے میں تو وہ کثرت سے شعر کہتے تھے۔ فتح پور میں ان کی وجہ سے شعر و شاعری کا مستقل ماحول قائم ہو گیا تھا۔ شہر میں اور اسکول میں وہ مختلف قسم کے مشاعرے کراتے تھے۔ اسکول کے سالانہ

مشاعرے میں وہ خصوصاً پیش پیش رہتے تھے اور ہر سال ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد کرواتے تھے۔ دوڑ بھاگ کر چندہ جمع کرتے تھے۔ مولانا حسرت موہانی چونکہ اسی اسکول کے طالب علم رہ چکے تھے اس لیے مشاعرے میں ضرور شرکت کرتے تھے۔ بہت سے ممتاز شاعر مثلاً جگر، اثر لکھنوی، شعری بھوپالی، شکیل بدایونی، خمار بارہ بنکوی، احسان دانش، شاعر لکھنوی، فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، اقبال صفی پوری، فنا نظامی کانپوری اور احمق پھپھوندوی وغیرہ کو میں نے انھیں مشاعروں میں دیکھا اور فرمان صاحب سے تو ان کے خاص مراسم ہو گئے تھے۔"

مسلم لیگ کی تنظیم اور اس کے لیے فنڈ جمع کرنے کی غرض سے ایک بڑا مشاعرہ فتح پور کے خاموش حال میں ہوا تھا۔ اس میں مسلم لیگ کے بڑے بڑے لیڈر شریک ہوئے تھے۔ شاعروں میں جگر اور حسرت موہانی خاص طور سے یاد ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اس مشاعرے کی صدارت کی تھی۔ فرمان صاحب نے پہلے پُر جوش تقریر کی تھی پھر شعر سنائے تھے۔ غرضیکہ ادیب و ناقد بننے سے پہلے فرمان صاحب کی شعر و شاعری کا ہمارے شہر میں ہر طرف چرچا تھا ان کے بعض اشعار اب تک مجھے یاد ہیں۔ اس وقت جو یاد آرہے ہیں سن لیجیے۔ چھپانے کا ارادہ ہو تو بہت سا کلام بھیج سکتا ہوں اس لیے کہ ان کی ایک ایک چیز میرے پاس محفوظ ہے۔

نہ میں شکوہ سنج قسمت نہ میں شاکی زمانہ
مجھے غم کے پاس لایا مرا شوق والہانہ
وہی ایک جذب صادق وہی ایک عزم کامل
جو قفس کی تیلیوں سے بھی بنا لے آشیانہ
نشیمن پھونکنے والو! چمن کو پھونک دینا تھا

ابھی امید تعمیر نشیمن پائی جاتی ہے
طبیعت انجمن کے نام سے گھبرائی جاتی ہے
کسی کی یاد وہ ظالم کہ پیہم آئی جاتی ہے

ایک دفعہ فرمان صاحب سخت بیمار ہوئے، بیماری کے فوراً بعد ایک طرحی مشاعرہ تھا۔ اس میں انھوں نے جو طرحی غزل پڑھی اس کے بعض اشعار یہ تھے:

وہ تسکیں دیتے جاتے تھے مگر تسکیں نہیں ہوتی
محبت میں کسی شے کی کمی معلوم ہوتی ہے
وہ دن بھی یاد ہیں جب ہچکیاں لے لے کے روتے تھے
مگر رہ رہ کے اب اکثر ہنسی معلوم ہوتی ہے

اس غزل کے قطعے میں انھوں نے میرا نام بھی اس طور سے شامل کر دیا تھا کہ:

"خدا نا خواستہ فرمان کی دنیا سے رخصت ہے
شباہت خاں کی آنکھوں میں نمی معلوم ہوتی ہے"

(۱۵)

ڈاکٹر فرمان نے شاعری سے کیوں پرہیز کیا؟ وجہ بھی ان سے سن لیجیے:

"شاعری کا ذوق تو اب بھی باقی ہے لیکن اپنی شاعری پہ کبھی اتنا اعتماد پیدا نہیں ہوا کہ انھیں طباعت و اشاعت کے لیے بھی قبول کر لیتا۔ میں نے صرف تسکین ذوق کے لیے شعر کہے ہیں۔۔۔ میں دوسروں کو نظمیں لکھ کے تو دے دیتا تھا لیکن اپنے نام سے کبھی نہیں چھپوایا۔ دلی سے "وحدت" اور "الامان" نکلتے تھے، ان میں مسلم لیگ کے سلسلہ میں ایک آدھ نظم چھپی تھی۔ غرض یہ کہ شاعری گھٹی میں پڑی تھی، آٹھویں جماعت تک مجھے سارے بڑے شاعروں کا کلام زبانی یاد ہو چکا تھا۔"

(۱۶)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کیونکہ اپنی شاعرانہ کاوشوں کو لائق طباعت نہ جانا، اس لیے ان کی تنقیدی قدر کی ضرورت نہیں لیکن اس کے باوجود سرسری نگاہ سے کلام کا جائزہ لینے پر ہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے باقاعدگی سے شاعری کی ہوتی تو شاعرانہ زاویہ نگاہ کے لحاظ سے ترقی پسند شعرا کے آس پاس ہوتے جبکہ شاعرانہ اسلوب بالخصوص غزلوں میں غزل کی کلاسیکی شعری روایات سے ہم آہنگ نظر آتے اور اس کی وجہ بھی دشوار نہیں کہ فرمان صاحب کے لیے حسرت موہانی وہی ہیں جو علامہ اقبال کے لیے مولانا رومی! لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ فرمان مقلد حسرت ہیں لیکن بعض اوقات غیر شعوری طور پر فرد اپنے آئیڈیل کا رنگ اپنا لیتا ہے، یہ جانے بغیر کہ وہ عکاس نہیں بلکہ منعکس ہے اور اسی کے ساتھ جب فرمان صاحب کا یہ فرمانا بھی شامل کرلیں تو بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے:

> ''میں کسی بھی چھوٹے یا بڑے ادیب سے متاثر نہیں ہوا۔ دراصل کسی کا اثر قبول کرنے سے گریز کرتا ہوں۔ احترام اپنی جگہ ہے پھر بھی اس میں اثر سے بچنے کی گنجائش موجود ہے۔ ہاں اس امر کا امکان ہے کہ جن لوگوں نے میرے شعور کی پختگی سے قبل اثر ڈالا ان سے اب بھی متاثر ہوں۔ بات کچھ ایسی ہے کہ میں شخصیتوں سے نہیں ان کے کام سے اثر قبول کرتا ہوں۔ میں نے حسرت کو دیکھا۔ ان کی شخصیت اور کام دونوں سے متاثر ہوا عملاً میں شوخی اور شگفتگی کا قائل ہوں۔'' (۱۷)

فرمان صاحب نے شاعری کو محض ''ہابی'' کی حد تک رکھا ہے۔ میں یہ نہیں جانتا کہ اس سے شاعری نفع میں رہی یا نقصان میں لیکن اتنا ہے کہ شاعری سے مملو تخلیقی حس جب تنقید میں شامل ہوگئی تو مقالات میں بہتر طور پر شاعری اور شاعرانہ حسیت کی تفہیم اور ترجمانی کا حق ادا کر سکے، اس پر مستزاد ان کی کمپیوٹر جیسی یادداشت۔ لہٰذا نقد شعر میں مضامین نو کے انبار لگا دیے اور آخری بات ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بارے میں کوئی شاعر یہ اعتراض نہیں کرسکتا کہ یہ تخلیقی کرب سے نا آشنا

نقاد ہے۔ نا آشنا تو دور کی بات ہے یہ تو تخلیقی کرب کے رمز شناس ہیں۔

ڈاکٹر اے بی اشرف (انقرہ/ترکی) ڈاکٹر صاحب کے خصوصی احباب میں شامل ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے حوالہ سے ایک دلچسپ مضمون بعنوان ''انکشاف راز اور میرا افتخار و امتیاز'' قلم بند کیا ہے۔ جس میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی پابند اور آزاد نظموں کے ساتھ ساتھ متعدد غزلیں بھی درج کی ہیں۔ سو بطور نمونہ، کلام اشعار پیش ہیں:

ڈاکٹر اے بی اشرف کے بقول:

> ''فرمان فتح پوری کی شاعری کا رشتہ ایک طرف تو کلاسیکل روایت سے جڑا ہوا ہے اور دوسری طرف جدید تر رویوں کا عکس بھی ان کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔ ان کے ابتدائی دور کی غزلیں اور نظمیں قادر الکلامی، زبان و بیان کی چاشنی اور مضامین حسن و رومان سے مملو ہیں۔ حسرت موہانی کے فیض محبت اور قلبی تعلق کا اثر ان کی غزلوں میں نمایاں ہے۔'' (۱۸)

اور اب ملاحظہ کیجئے یہ اشعار:

مجھے اذنِ گفتگو دے، کبھی یا نہ دے زمانہ
میں وہی کہوں گا لیکن جو ہے بات منصفانہ

یہ کیسے ایک جذبِ دل کے ہیں دو دو اثر پیدا
اِدھر شعلہ اُدھر شبنم اِدھر پنہاں اُدھر پیدا
تری پرواز ہی ظالم تری دشمن نہ بن جائے
ابھی دو دن نہیں گزرے ہوئے ہیں بال و پر پیدا

داستانِ غم کی بالا علان سنائیں آؤ

آنکھ پھر گردشِ دوراں سے ملائیں آؤ
جن میں اپنوں کے سوا ہاتھ نہیں غیروں کا
دل کے وہ زخم بھی دیکھو گے دکھائیں آؤ
بے اجازت بھی کبھی جام اٹھائیں بڑھ کر
اتنی تو جرأتِ رندانہ بڑھائیں آؤ

ذکرِ جور و ستم یار کروں یا نہ کروں
طبعِ نازک کو گراں بار کروں یا نہ کروں
جن سے آ جائے گی ترے چاند سے ماتھے پہ شکن
ان خیالات کا اظہار کروں یا نہ کروں
سوچتا ہوں کہیں دنیا کو ضرورت نہ پڑے
زندگی وقفِ غمِ یار کروں یا نہ کروں

ملی جلی سی اندھیروں میں روشنی کب تک
امید و بیم مسلسل کی زندگی کب تک
نفس نفس میں حرارت نظر نظر میں تپش
لگی رہے گی بدن میں یہ آگ سی کب تک

بس اتنی بات سے ناخوش ہیں ساکنانِ فلک
کہ ان سے آنکھ ملانے لگے ہیں خاک نشیں
بھری بہار میں اتنا مہیب سناٹا

نہ جشنِ بادہ گساراں ، نہ رقصِ ماہ جبیں
وہ آرہا ہے ہجومِ بلا کشاں ساقی
سنبھل کہ آج ترے میکدہ کی خیر نہیں

اس ضمن میں ڈاکٹر اے بی اشرف مزید رقم طراز ہیں:

"شعر گوئی کا ذوق انہیں اس ماحول سے ملا جس میں ان کی تربیت و پرداخت ہوئی۔ ان کا مزاج لڑکپن سے شاعرانہ تھا اور اس میں ان کا گھر اور گھر سے باہر کی فضا کا بڑا دخل تھا۔ ان کے بڑے بھائی شمشاد علی تنہا تخلص کرتے تھے اور خوبصورت شعر کہتے تھے۔ ان کے چچا صدیق حسن صدیق فارسی، اردو اور ہندی تینوں زبانوں میں مشقِ سخن رکھتے تھے۔ گویا شاعرانہ ذوق ان کو بچپن سے قدرت کی طرف سے بھی ملا تھا اور ماحول نے بھی اس کی آبیاری کی تھی اور پھر فضائے شاعرانہ سے انہوں نے کسبِ فیض کیا اور بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے۔ ابتدائی دور میں زیادہ تر ظریفانہ اور مزاحیہ شعر کہتے رہے۔ اپنے مزاحیہ شعروں میں سے بعض اشعار انہوں نے اپنی تصنیف "اردو کی ظریفانہ شاعری" مطبوعہ فیروز سنز لاہور میں بغیر کسی حوالے کے نقل کیے ہیں۔ ایک طرحی مشاعرہ تھا جس میں طرح مصرع یہ دیا گیا تھا کہ:

'دونوں عالم کی حقیقت ایک پیمانے میں ہے'

اتفاق سے اس مشاعرے کی صدارت ایک ایسے صاحب حیثیت بزرگ کر رہے تھے جو یک چشم تھے۔ چنانچہ فرمان صاحب نے جیسے ہی اپنا مطلع اس طور پر پڑھا کہ:

واہ رے محبوب کتنی دلکشی گانے میں ہے
دونوں عالم کی حقیقت ایک پیمانے میں ہے

تو سارا مجمع لوٹ پوٹ ہو گیا لیکن صدر صاحب کٹ کے رہ گئے۔

اسی طرح تحریک پاکستان کے زمانہ میں فرمان صاحب بہت فعال رہے۔ نہ صرف جلسوں میں تقاریر دل پذیر کرتے رہے بلکہ قومی شاعری بھی تخلیق کرتے رہے۔ مسلم لیگ کے جلسوں میں عموماً ان کی نظمیں پڑھی جاتی تھیں، چنانچہ ان کی ایک مخمس نما نظم جس کے ٹیپ کا مصرعہ تھا:

سب کچھ ہیں مگر قوم کے غدار نہیں ہیں؛

بہت مقبول ہوئی تھی اور ہر جلسہ میں اس کے پڑھنے اور سنانے کا تقاضا کیا جاتا تھا۔ انہوں نے اس دور میں بہت سی سیاسی نظمیں اور قطعات لکھے۔ پاکستان بنا تو وہ کراچی آگئے۔ بعد کو پاکستان کے سیاسی و سماجی حالات نے ان کے دماغ پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ وہ خواب جو ایک آزاد و الگ مملکت کی صورت میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے دیکھا تھا اس کی تعبیر کچھ زیادہ خوشگوار اور دلکش نہ نکلی تھی۔ نو دولتیے طبقے کے عروج، اقتدار کی شکست و ریخت، مارشل لا اور سیاست کی قلابازیوں نے اس خواب کو منتشر کر کے رکھ دیا۔ فیض نے کہا تھا:

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

فرمان صاحب ایک صاحب احساس انسان ہیں وہ بھی ان حالات سے اثر لیے بغیر نہیں رہے چنانچہ انہوں نے اپنے ردعمل کو اشعار کے ذریعے اس طور پر ظاہر کیا:

تھکے تھکے سے اُجالے بجھے بجھے سے چراغ
کوئی نشان دل و جاں نہ زندگی کا سراغ

یہ صبح نو ہے تو اس صبح نو کو میرا سلام
نہ تازگی کی علامت نہ روشنی کا سراغ
ابھی نہ ڈھونڈ چمن میں خرام کبک دری
اُچک رہے ہیں ابھی قمریوں کے بھیس میں زاغ

تیرگی آج بھی تاحد نظر ہے کہ جو تھی
زندگی یعنی وہی خاک بسر ہے کہ جو تھی
آپ کہیے کہ مکمل ہے چمن زار حیات
میرے نزدیک وہی اب بھی کسر ہے کہ جو تھی

ظاہر ہے یہ جذبات ہر اس صاحب احساس پاکستانی کی آواز ہیں جو اپنے وطن عزیز کی صورت بگاڑنے والے مقتدر طبقے کے کرتوتوں کو مجبوری اور بے بسی سے دیکھ رہا ہے۔

ان اشعار کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے اشعار بھی ملاحظہ فرمایئے جو ان حالات کی تلخی کے باوجود کیسے خوبصورت اور دلکش شاعرانہ اسلوب میں ادا ہوئے ہیں:

وہ چاند ہے سچ مچ کا تو پھر اس سے کہو نا
اترے مرے گھر میں کبھی دالان میں آئے
سایہ ہے تو گزرے کسی دیوار کو چھو کر
ہے دھوپ تو اونچائی سے ڈھلوان میں آئے
ہے جسم تو بن جائے مری روح کا مسکن
ہے جان تو پھر اس تنِ بے جان میں آئے
تتلی ہے تو احساس کی کلیوں سے بھی کھیلے
ہے پھول تو تخیل کے گلدان میں آئے

غنچہ ہے تو کھل جائے مرے دل کی صدا پر
خوشبو ہے تو زخموں کے گلستان میں آئے

پھر سقوط ڈھاکہ کا سانحہ پیش آیا۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی سیاسی کشمکش سے رونما ہونے والے واقعات نے فرمان صاحب کو بے حد افسردہ و متاثر کیا۔ یہ حادثہ ایسا تباہ کن اور اتنا اچانک تھا کہ جیسے سارے عناصر اربعہ جن سے انسانی زندگی عبارت ہے۔ یعنی آگ، ہوا، پانی، اور مٹی، آدم سے ہمیشہ کے لیے بیزار ہو گئے ہوں اور آدمی کے خلاف بغاوت کر رہے ہوں۔ فرمان صاحب نے اس حادثہ کی شدت کو نظم کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ جس کا عنوان ہے ''عناصر اربعہ کی بغاوت'' یہ طویل نظم مطالعے کے لائق ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی علمی، تنقیدی اور تحقیقی شخصیت اس قدر غالب اور مرعوب کن رہی ہے کہ ان کی تخلیقی توانائی اور شعری وژن کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا اور اس میں قصور نقادانِ فن یا علماء کا نہیں کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا یہ پہلو ان کے سامنے آیا ہی نہیں یہ تو محض اتفاق ہے کہ مجھ جیسے ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کو یہ شرف حاصل ہوا کہ ان کے کلام کے کچھ حصوں کو پڑھنے کا موقع مل گیا اور اس طرح یہ انکشاف میری قسمت میں لکھا گیا کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری محض مختلف الحیثیات عالم ہی نہیں بلکہ ایک خوبصورت فنکار، صاحب احساس تخلیق کار اور متاثر کرنے والے شاعر بھی ہیں۔ کاش وہ اپنا مجموعہ کلام طبع کرائیں تا کہ نقادانِ فن کاروں کو ان کے اس پہلو کو بھی جانچنے کا موقع ملے۔ میں تو اس جگہ چند چیزیں ان کی بیاض سے نقل کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

نظمیں

''عناصر اربعہ کی بغاوت''

آگ

جو اب تک
جسم کی ٹھنڈی مٹی میں آسودۂ خواب تھی
یک بیک جاگ اٹھی
شعلہ بن کر دل و جان کو پگھلا گئی
ہر بن مو سے آتش فشاں پھٹ پڑا، لاوا بہنے لگا
ساز و سامانِ جاں، آرزو کا مکاں جل کے راکھ ہو گیا

اور ہوا
جس کی ہلکی سی جنبش سے غنچوں کے ملبوس خوشبو میں بس جائیں
ڈالیاں بوڑھے پیڑوں کی نخلِ جواں کی طرح جھوم اٹھیں
زرد پتے زمیں پر اتر کر تھرکنے لگیں
رقص کرتے ہوئے گنگناتے ہوئے
جان اپنی بہاروں پہ قرباں کرنے کو معراج سمجھیں
وہ ہوا یک بیک چونک اٹھی اور بگولے بنا کر فضا میں اڑانے لگی
اور بگولے
ذرا دیر میں آ گئے کالی آندھی کا طوفان لے کر
پھول پھل سے لدے پیڑ
سرسبز و شاداب پودے، جواں ٹہنیاں

گاؤں کی سادہ و پرسکوں بستیاں
آن کی آن میں تودۂ خاک تھیں
شہر کے خوش نما بام و در، گرد سے اَٹ گئے
قمقمے بجھ گئے
ٹوٹ کر تار بجلی کے گرنے لگے
راستے تیرگی کے مہابن میں گم ہو گئے
شیشے کمروں کی کھڑکی کے چور ہو گئے
اور شیشوں کی کرچیں
خود اپنے مکینوں کے چہروں کو زخمیں بنانے لگیں
اور پانی
جسے لوگ بارانِ رحمت سے تشبیہ دیں
جس کی چھینٹوں سے سوکھی ہوئی کھیتیاں، مردہ تن آدمی، جی اٹھیں
باچھیں کھل جائیں مظلوم ہاری کی، دہقان کی
بھوک سے نیم جاں بے زمیں کاشتکارانِ مغموم کی
بانسری بھولے بھالے کسانوں کی بستی میں بجنے لگی
جس کا اک ایک قطرہ نویدِ سکوں وجہِ تازہ دمی خستہ جاں کے لیے
جس کی اک دھار، بجلی کی لہروں کی قوت
کارخانوں کی ضامن، ملوں کا مقدر
غم نصیبوں کی محنت کشوں کی امیدوں کا مرکز
رزقِ مزدور کا آسرا
جس کی اک بوند در زعدن کا سبب، حاصلِ صد گہر، جس کا اک اک صدف

جس کا رنگ صاف شفاف اتنا کہ آئینہ شرمائے
حسن خود بیں کو مدِ مقابل نظر آئے
دیکھتا ہوں کہ چشم زدن میں وہی بھی چاندنی سا پانی برنگِ شفق
خون بن کر فلک سے برسنے لگا
شاہراہوں سے، کوچوں سے، گلیوں سے، پگڈنڈیوں سے اُبلنے لگا
جھیل، تالاب، نالے، ندی، نہر و دریا اُمنڈ آئے
اور پھر بہا لے گئے جسم و جاں کی کھڑی فصل کو
اور مٹی
جسے روحِ آدم کا مسکن کہیں
اور جسے
محترم جان کو، عرشیوں نے خدا کے مقرب فرشتوں نے سجدہ کیا
جس نے حضرت محمدؐ کو، عیسیٰ کو، مریم کو، گوتم کو
سقراط کو، طاہرہ قرۃ العین کو
کوکھ سے اپنی دے کر جنم
رحمتِ عام کا، امن کا، پاکبازی کا، عرفان و ایثار کا
حق پرستی کا پرچم فضاؤں میں لہرا دیا
جس کی زرخیزی، نرمی، نمی، تازگی
ایک ننھے سے دانے کو پیغامِ خرمن بصد دلبری
جس کی رنگینی و دلکشی و پختگی، تاج کا کر و فر، قلعے کا دبدبہ
اپنی چھاتی پہ جس نے تناور درختوں کو، کھیتوں کو، باغات کو
بحر و کہسار کو، دشت و دریا کو دے کر جگہ

آدمی کے لیے زیست آسان کر دی
اب وہی مٹی کیا جانے کس لیے
زندہ لاشیں، شہر میں، گاؤں میں، باغ میں، راغ میں
قریے قریے میں بکھری پڑی ہے
الغرض آگ، پانی، ہوا، اور مٹی، خدا جانے کیوں
سب کے سب، یک بیک
اپنے ذاتی کمالات سے منحرف ہو گئے
خود کو جھٹلا گئے
اپنے قالب کو بے آسرا، بے اماں کر گئے
اب یہ عالم ہے کہ روح
بے گھر ہے، بے یار ہے، بے مددگار ہے
ڈھونڈتی پھر رہی ہے
کرائے کا گھر
پی ای سی ایچ ایس میں، گلشن میں، اور ناظم آباد میں

لفظ و معنی کا فرق

سوچنا میرا مقدر ہے، مرا جرم ہے، میں مجرم ہوں
بارہا جس نے سزا پائی ہے عادی مجرم
کوئی عالم ہو
بہ ہر رنگ، بہ ہر طور، بہ ہر گام، بہ ہر حال، میں سوچے جاؤں
سوچ میری، مری دمساز ہے، غم خوار ہے، مونس ہے مری

میرا سرمایۂ ہستی ہے، علامت ہے مرے جینے کی
جسم و جاں کے لیے مہمیز ہے، احساس کی بیداری ہے
لیکن اس سوچ کو
جس نے مجھ کو
میرے ماحول کو، گھر کو، مرے بام و در کو
چشمِ بے خواب بنا رکھا ہے
تا بہ کے حسنِ تخیل کی قبا پہنا کر
فن کے زنداں میں مقید رکھوں
نغمہ و شعر سے تعبیر کروں، نت نئے گیت لکھوں
گیت میں رنگ بھروں، درد سموئے جاؤں
سازِ احساس پہ گاتا ہی رہوں اور بجاتا ہی رہوں دل کا ستار
دامنِ شوق پہ نغمات بکھیرے جاؤں
کربِ ہستی کو، غمِ زیست کو بخشوں لبِ جاناں کی مٹھاس
شعر کی نوک پلک یونہی سنوارے جاؤں
استعاروں کے کنایوں کے چمن زار کھلائے جاؤں
دشت کو باغ بناتا ہی چلا جاؤں مگر کس کے لیے
خوبصورت، نئی، پاکیزہ تراکیب تراشوں بھی تو حاصل کیا ہے
لفظ، حرفوں کے گھروندے ہیں
گھروندوں کی حقیقت معلوم
استعارات و کنایات و تراکیب، کھلونے ہیں
کھلونے سے میں کھیلوں کب تک

قافیے مانا مری ذات کے آہنگ سے ہم آہنگ ہیں
اور ردیفوں نے اس آہنگ میں تاثیر بھی پیدا کردی ہے
دل کا آہنگ کہاں، حرف کی آواز کہاں
لفظ بے جان ہیں، بے جان صدا کیا دیں گے
اور صدا دیں بھی تو کیا؟
کون ہے سننے والا
گونگی بہری ہے فضا
اس فضا میں مرے ہمدم مرے دوست
شاعری درد کا درماں تو نہیں ہو سکتی
سوچ کے زخم کا مرہم تو نہیں بن سکتی
لفظ معنی کے برابر تو نہیں ہو سکتے

خط لکھنے کے اصرار پر

تم کو اصرار ہے
تم یہ ضد کر رہی ہو کہ میں
خط لکھوں اور لکھتا رہوں
کیوں
تا کہ تم کو مرے خط کے حرفوں سے لفظوں سے اشعار سے
اک طرح کا سکوں، خلوتوں کی خموشی میں ملتا رہے
دل بہلتا رہے
میرا دل بھی یہی چاہتا ہے مگر

یہ بھی سوچا بھی
میں تمہیں کیا لکھوں اور کیسے لکھوں
جبکہ نام
اور القاب و آداب لکھنے کے سب راستے بند ہیں
اور ہر سوز پر جبر تہذیب کے سخت پہرے لگے ہیں
فضا میں تمہیں کچھ بتاؤ
میں تم کو مخاطب کروں بھی تو کیسے کروں
سوچتا ہوں کبھی جانِ من، جانِ جاں، جانِ فرماں لکھوں
تو محسوس ہوتا ہے یہ جھوٹ ہے
اس لیے کہ مرے جسم میں جان ہے بھی کہاں
اور ہو بھی تو میں جان سے اپنی بیزار ہوں
بن تمہارے مری جان، میرے لیے ایک آزار ہے
جسم پر بار ہے
جب یہ صورت ہو
پھر میں تمہیں جانِ من، جانِ جاں، جانِ فرماں کیونکر لکھوں
اس لیے خط کے لکھنے پہ اصرار بے سود ہے

پیمانِ وفا (۱۴ اگست)

اے سرزمینِ پاک ما
اے یومِ پاکستانِ ما
اے جانِ ما اے جانِ جاں
دن یاد تو ہوں گے ابھی
جب میں نے تجھ کو خواب میں دیکھا تھا
تیرے نام سے باندھا تھا پیمانِ وفا پہلے پہل
میں کیا کہوں، کیوں کر کہوں تُو خود بتا
اے جانِ ما اے جانِ جاں
وہ یاد تو ہوگا سماں
جب میرے جسم و جان کی اٹھتی جوانی پر
ترے حسنِ تخیّل کا فسوں چھایا ہوا تھا
اور میں بیگانۂ سود و زیاں
مستِ مئے مہر و وفا
سمجھا تھا تیرے نام کو
بعد از خدا، بعد از محمد مصطفٰےؐ
درمانِ دل، تسکینِ جاں
اے جانِ ما اے جانِ جاں
کچھ یاد تو ہوگا ابھی وہ موسمِ گل
جب مرا دیوانہ پن، میرا جنوں

شہرِ افکارِ حسک حاصلِ فرزانگی
سرمایۂ فکر و نظر، وجہِ نشاطِ دوستاں
غارت گرِ عیش و سکونِ دشمناں
اور میں آشفتہ سر
دامن دریدہ خستہ تن
تیرے تصور میں مگن، اقبال کے الفاظ میں
ہر دم رواں ہیم دواں، بحرانہ صحرا، ایم بہ ایم
قریہ بہ قریہ کو بکو لمحہ بہ لمحہ دم بدم
دیتا تھا تیرے نام کی
شہروں میں قصبوں میں اذاں
اے جانِ ما اے جانِ جاں
وہ یاد تو ہوں گے ابھی شام و سحر
جب میری خاموشی حریفِ لذتِ تقریر تھی
اور تقریر مری رکھتی تھی جادو کا اثر
الفاظ میں عزمِ جواں
انداز میں اک بانکپن
قلب و نظر کا مدعا، فکر و نظر کا ماحصل
صورت تری، پیکر ترا
المختصر تھی کج کلاہی میری رشکِ سطوتِ تاجِ شہاں
پھر کیا ہوا
اے جانِ ما اے جانِ جاں

جو کچھ ہوا

دیکھا تو ہو گا جھک گئی تھی ایک دن
میری زمین آرزو پر آسمانوں کی جبیں
اور میں نے یکدم لے لیا تھا اپنی آغوشِ محبت میں تجھے
کس پیار سے، کس چاؤ سے
اور تو نے چھیڑ دی تھی
روح کے تاروں پہ خود کی غزل
من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری
لیکن وہ عالم اب کہاں
اے جان ما اے جانِ جاں
جب میں نے تجھ کو خواب میں دیکھا
اور باندھا تھا پیمانِ وفا

غزل

ڈھونڈتا تھا میں جس کو تتلیوں میں پھولوں میں
میرے دل کا کانٹا تھا ، مل گیا ببولوں میں
ذہن ساحر و ساحر وسوسوں کا زائیدہ
دل یقین کا بیٹا ، عشق کے رسولوں میں
درد ہجر کا صحرا ، تیری یاد سے شاداب
شاخ گل کی رعنائی سر و قد بگولوں میں
میری فطرت آزاد مثل موج آوارہ
تو جنم کا زندانی بند ہے اصولوں میں
تیرے پیار کے سپنے ، میری آنکھ میں جیسے
راہ گیر گھر جائے ریت کے بگولوں میں
باغ بھی ہے برکھا بھی اس کے بن مگر فرمان
لطف کیا ہے پینگوں میں کیا دھرا ہے جھولوں میں

غزل

دل ہی دل میں وہ مری بات پہ ہنستا ہو گا
میں جو کہتا ہوں اسے جھوٹ سمجھتا ہو گا
یہ جو چمکے ہے شبِ غم مری، جگنو کی طرح
سرخ ٹیکا کسی ماتھے پہ دمکتا ہو گا

بے خبر جادۂ و منزل سے چلا جاتا ہوں
یہ سمجھ کر کہ مری راہ وہ تکتا ہو گا
کیا سماں ہو گا کہ جب رات کی رانی بن کر
جسم تیرا مرے آنگن میں مہکتا ہو گا

غزل

یہ لطف بھی کم نہیں ہے اس کا کہ مجھ سے وہ بے گماں ملے ہے
یہاں ملے ہے وہاں ملے ہے، عیاں ملے ہے، نہاں ملے ہے
خرد کی باتیں خرد سے ہوں گی، جنوں سے مل لو کہ ہوش میں ہے
وگرنہ یہ بے وفا زمانہ کبھی کسی سے کہاں ملے ہے
شفق میں، بادل میں، ماہ و انجم میں، لالہ و گل میں، جام و دل میں
بریگ یہ خوسر زمانہ کبھی کسی سے کہاں ملے ہے
یہ میری پستی کی ہے بلندی کہ میرا گردش میں ہے ستارہ
تلاش میں، میں زمیں کی نکلوں تو راہ میں آسماں ملے ہے

غزل

کوئی ہم سایہ نہ سایہ نہ تو سائے کا گماں
یہ میں کس شہر میں بستا ہوں بسا ہوں کیسا
اور تو اور ہیں خود مجھ کو نہیں اپنی خبر
بھیڑ میں دیکھنے والوں کی چھپا ہوں کیسا

لعنتیں بھیجتی ہے میری خدائی مجھ پہ
میں خدا بن کے تو گیا ہوں پہ بنا ہوں کیسا
بن کے آئینۂ امکانِ جہانِ تازہ
پشتِ دیوارِ تخیل میں لگا ہوں کیسا
کوئی شعلہ نہ شرارہ نہ دھوئیں کے آثار
جل کے فرمان مگر راکھ ہوا ہوں کیسا

غزل

چاند تارے بن کے بجلی رات میں نکلے تو ہیں
جان کے دشمن ہماری گھات میں نکلے تو ہیں
یہ تلطف یہ توجہ دیکھیے کب تک رہے
ہاتھ میں وہ ہاتھ دے کر رات میں نکلے تو ہیں
آدمی فیضِ نظر سے جن کے انسان بن گیا
لوگ کچھ ایسے بھی حیوانات میں نکلے تو ہیں
اور اگر پانی زمیں سے بڑھ کے سر تک آ گیا
لوگ چھتری تان کر برسات میں نکلے تو ہیں
دیکھیے کیا ہو کسی سے آنکھ لگنے کا مآل
سینکڑوں فتنے ذرا سی بات میں نکلے تو ہیں
جانے کتنے ماہ و انجم جانے کتنے آفتاب
چھاننے سے خاک کے ذرات میں نکلے تو ہیں

کیا عجب اک دن یہی بن جائیں یادوں کے گلاب
سرخ دانے زخم احساسات میں نکلے تو ہیں

غزل

منہ کا مزہ خراب کچھ اتنا لگے مجھے
میٹھا سے میٹھا گھونٹ بھی کڑوا لگے مجھے
وہ ساتھ ہوں دشت نوردی بھی سیر گل
اس کے بغیر پھول بھی کانٹا لگے مجھے
ملنے کے نام سے بھی ٹھٹھک جانا ، کانپنا
ملنے کا یہ بھی رنگ سہانا لگے مجھے
اب مار آستیں کی ضرورت نہیں رہی
ہر شخص اپنے آپ کو ڈستا لگے مجھے
باتوں میں اس کے زہر بھی امرت کے ساتھ ساتھ
قاتل بھی ، کبھی وہ مسیحا لگے مجھے
فرمانؔ اپنے ذوقِ سخن کو یہ کیا ہوا
تازہ سے تازہ شعر پرانا لگے مجھے

غزل

بے زخمی کیا بے زخمی سے بڑھ کے بھی یاری لگے
ڈھب ستم گاری کا تازہ، اس کی غمخواری لگے
حال پوچھے جائے ہے اور مسکرائے جائے ہے
پرسشِ احوال بھی اس کی ادا کاری لگے
آستیں میں بت، بغل میں بت، نگاہ و دل میں بت
پوجنے والا بتوں کا ، بت کا بیوپاری لگے
میرے جسم و جاں کو جس کی تپش پگھلا گئی
کاش اس پتھر بدن کو بھی وہ بیماری لگے
رنگ و رخ، ماتھے کی بندی، برہمن زادی بنائے
آنکھ سے، رفتار سے آ ہوئے تاتاری لگے
اب کے شہر درد کے موسم کی تبدیلی نہ پوچھ
مختصر یہ ہے کہ دن بھی رات سے بھاری لگے

غزل

اُبھر رہی ہیں اُفق پہ وہ سرخیاں تازہ
شبِ الم پہ سحر کس رہی ہے آوازہ
سنور رہی ہے اندازِ نو عروسِ حیات
بکھر رہا ہے نظامِ کہن کا شیرازہ

کہیں چھپائے چھپی ہیں سیاہیاں دل کی
ہزار عارض و رخ پہ کوئی ملے غازہ
نہ تیری جلوہ طرازی نو بہ نو کا شمار
نہ میری قوت جذب نظر کا اندازہ
نہ سیر گل کی اجازت نہ اذن گشت چمن
یہ بند ہے کہ کھلا ہے قفس کا دروازہ

ضمیمہ (10)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نجی، تعلیمی اور منصبی کوائف

ڈاکٹر فرمان فتح پوری متنوع ذہنی دلچسپیوں کی حامل جامع حیثیات شخصیت کا نام ہے، ڈاکٹر صاحب کی تحریر کردہ خودنوشت گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی جو مفصل اور دلچسپ ہونے کیساتھ ساتھ ایام گذشتہ کا آئینہ بھی ہے۔ تمام علمی فتوحات کا تذکرہ تو جداگانہ طور پر ہو گیا یہاں ان کے بارے میں اساسی معلومات وکوائف کا کیپسول پیش ہے۔

نام، وطن، تاریخ ولادت

نام: سید دلدار علی
قلمی نام: فرمان فتح پوری
تاریخ ولادت: ۲۶/جنوری ۱۹۲۶ء
جائے ولادت: فتح پور (ہسوہ) یوپی ہندوستان
والد کا نام: سید عاشق علی (متوفی ۱۹۳۳ء)
قومی اعزاز: ستارۂ امتیاز
موجودہ منصب: رکن سندھ پبلک سروس کمیشن۔ حیدرآباد

سابقہ مشاغل/مناصب:

۱۔ ۱۹۳۶ء میں ہائی اسکول پاس کرنے کے فوراً بعد مدرسہ اسلامیہ (مسلم ہائی اسکول فتح پور) میں انگریزی اور ریاضی کے ٹیچر ہو گئے۔

۲۔ ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۳ء آڈٹ ڈیپارٹ منٹ کے تحت بحیثیت پروشنر، ڈویژنل اکاونٹنٹ، اے جی پی آر سے وابستہ رہے۔

۳۔ ۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۷ء سررشتہ تعلیم کراچی کے تحت گورنمنٹ ہائی اسکول کوتوال بلڈنگ میں ریاضی اور انگریزی کے معلم رہے۔

۴۔ اگست ۱۹۵۸ء میں شعبہ اردو جامعہ کراچی سے منسلک ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے پروفیسر و صدر شعبہ کے منصب تک پہنچے۔

۵۔ ۱۹۸۵ء میں وفاقی حکومت نے اردو ڈکشنری بورڈ کے لیے ان کی خدمات مستعار لیں چنانچہ وہ ایک سال بیک وقت، شعبہ اردو جامعہ کراچی اور اردو ڈکشنری بورڈ کے نگران رہے۔

۶۔ جنوری ۱۹۸۶ء سے اردو ڈکشنری بورڈ کراچی کے چیف ایڈیٹر اور سیکرٹری کی حیثیت میں وفاقی وزارت تعلیم حکومت پاکستان سے وابستہ ہیں۔

تعلیمی کوائف

غیر رسمی تعلیم

۱۔ ناظرہ قرآن اور فارسی کی ابتدائی کتابیں مثل مصدر نامہ گلستان، بوستان، دستور الصبیان اور کریما و ماقیماں وغیرہ گھر میں والد صاحب اور چچا اور چچی سے پڑھیں۔ اس کے بعد رسمی تعلیم کے لئے والد کی وفات کے بعد ۱۹۳۳ء میں سرکاری ابتدائی مدرسے میں داخل ہوئے اور بتدریج تعلیم کی اعلیٰ اسناد حاصل کیں۔

۲۔ فتح پور کے قیام میں مدرسہ اسلامیہ کے مولوی محمد اسحاق اور مولوی سید عبدالوحید سے دو سال نجی طور پر عربی و فارسی پڑھی۔

۳۔ آبائی گاؤں کے پنڈت مہابیر پرشاد سے ہندی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ رامائن کا خصوصی درس لیا۔

رسمی تعلیم

۱۔ ورنیکلر مڈل اول آنے پر وظیفہ حاصل کیا۔

۲۔ ہائی اسکول:

۱۹۴۶ء میں مدرسہ اسلامیہ فتح پور سے درجہ اول میں الہ آباد بورڈ سے پاس کیا اور تین مضامین میں امتیاز حاصل کر کے یوپی میں ساتویں پوزیشن کے ساتھ سرکاری وظیفہ کے مستحق قرار پائے۔

۳۔ ایف اے:

۱۹۴۸ء میں الہ آباد بورڈ، یوپی سے سیکنڈ ڈویژن میں ایف اے کیا۔

۴۔ بی۔اے:

۱۹۵۰ء میں آگرہ یونیورسٹی سے سیکنڈ ڈویژن میں بی اے پاس کیا۔

۵۔ ایل ایل بی:

۱۹۵۳ء میں ایس ایم لاء کالج کراچی سے ایل ایل بی کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

۶۔ بی ٹی

۱۹۵۵ء میں گورنمنٹ ٹیچر ٹریننگ کالج کراچی سے سیکنڈ ڈویژن میں امتحان پاس کیا۔

۷۔ ایم اے:

۱۹۵۸ء میں فرسٹ پوزیشن کے ساتھ کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کیا۔

۸۔ پی ایچ ڈی:

۱۹۶۴ء میں کراچی یونیورسٹی سے "اردو کی منظوم داستانوں" پر تحقیقی کام کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔

نوٹ: بقول ڈاکٹر سید معین الرحمٰن:

پاکستان کی کسی یونیورسٹی سے وابستہ فرمان فتح پوری پہلے محقق اور پروفیسر ہیں جنہیں اردو میں پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی اعلیٰ ترین علمی اسناد حاصل کرنے کا امتیاز حاصل ہوا۔ (۸)

۹۔ ڈی لٹ

"اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" پر کراچی یونیورسٹی نے ۱۹۷۴ء میں ڈی لٹ کی ڈگری دی۔

خاندانی کوائف:

۱۔ شادی

۱۹۴۷ء میں خالہ زاد بہن سلمٰی سے

۲۔ بھائی

سید شمشاد علی تنہا۔ فرمان صاحب سے چھ سات سال بڑے ہیں۔

ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ اپنے بیٹے سید آباد علی ڈائریکٹر اینڈ لائبریرین آف اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے ساتھ کراچی میں سکونت پذیر ہیں۔

۳۔ بہنیں

۱) سیدہ خاتون: سب سے بڑی بہن، کم عمری میں بیوہ ہو گئیں تھیں، کراچی میں

انتقال کیا اور یہیں دفن ہوئیں۔ ان کے بیٹے سید عبدالعلی وارثی بابا محبت شاہ وارثی، محبت نگر، ملیر سٹی کراچی کے سجادہ نشین ہیں۔

۲) طیبہ خاتون: یہ بھی عمر میں فرمان صاحب سے بڑی تھیں، وفات پا گئیں، ہندوستان میں مدفون ہیں ان کا خاندان ہندوستان ہی میں آباد ہے۔

۵۔ بیٹے

۱) سید ابرار علی

پی ای بی ای (الیکٹرک) اے ایم ائی ای (پاک)

ایف آئی ای ای (پاک) ایم آئی ای ای ای

(یو ایس اے) ڈپلوما جرمن ٹکنولوجی ڈپٹی چیف انجینئر

الیکٹرک سپلائی کارپوریشن کراچی، اردو انگریزی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں اور اپنے خاص موضوعات کے ساتھ ساتھ خصوصی تعلیم سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ پاکستان کے متعدد رفاہی اداروں کے اعزازی رکن و مشیر ہیں۔

۲) ابصار علی

ایم ڈی۔ ڈپلومیٹ آف امریکن بورڈ آف میڈیسن۔ ڈپلومیٹ آف امریکن بورڈ آف ممبر نفرالوجی، ممبر آف امریکن کالج آف فزیشن، گریجویٹ آف ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی۔ فلوریڈا، یو ایس اے میں اپنے طبی پیشے سے منسلک و مقیم

۶۔ بیٹیاں

۱) شمیم سلمان

ایم ڈی۔ گریجویٹ آف ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی۔ ڈپلومیٹ آف امریکن بورڈ آف انٹرنل میڈیسن۔ ڈپلومیٹ آف امریکن بورڈ آف ہیماٹولوجی ڈپلومیٹ آف امریکن بورڈ آف انکالوجی۔ فیلو آف امریکن کالج آف فزیشن، چیئر مین اردو اکیڈمی نیویارک۔

۲) نجمہ ہاشمی

ماسٹر آف لائبریری سائنس (فرسٹ کلاس فرسٹ) ایم اے (سوشل ورک) فرسٹ کلاس فرسٹ۔ ریسرچ اسکالر پی ایچ ڈی، اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ سماجی بہبود، جامعہ کراچی۔

۳) وسیم صلاح الدین:

ایم بی بی ایس، ایم اے (وہانا)، گریجویٹ آف ڈاؤ میڈیکل کالج، کراچی، میڈیکل آفیسر محکمہ صحت حکومت سندھ، میڈیکل ڈائریکٹر صدف کلینک کراچی۔

۴) عظمیٰ فرمان:

بی ایس سی، ایم اے (اردو) فرسٹ کلاس دوسری پوزیشن کے ساتھ، جامعہ کراچی میں پی ایچ ڈی کی ریسرچ اسکالر، لیکچرار شعبہ اردو جناح یونیورسٹی برائے خواتین کراچی۔ والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تنقیدی مقالات قلم بند کرتی ہیں جو متعدد ادبی جرائد میں طبع ہوتے ہیں۔

۷۔ بہوئیں

۱) مسز عقیلہ ابرار

ایم ایس سی (باٹنی) ایم اے (اسپیشل ایجوکیشن) فرسٹ کلاس فرسٹ، ڈائریکٹر اسپیشل ٹیچرز اینڈ پیرنٹس ریسورس سنٹر کراچی، (ایس ٹی پی آر سی) سوویٹر اینڈ ریویو آف ٹیکنیکل فورمز اینڈ ڈسکشنز۔

۲) مسز سنبل ابصار

اسپیشلسٹ ارسلان سوفٹویری اینڈ کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ کراچی کی بانی اور مشیر فلوریڈا امریکہ میں مقیم۔

۸۔ سلسلہ نیاز و نگار

''نگار'' ۱۹۲۲ میں جاری ہوا۔ آگرہ اور بھوپال ہوتے ہوئے ۱۹۲۷ میں علامہ نیاز کے ساتھ لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ جنوری ۱۹۶۲ء سے ڈاکٹر فرمان صاحب کی ادارت میں کراچی سے بھی شائع ہونے لگا۔ بعد میں لکھنؤ سے بند ہو گیا۔ کراچی سے یہ علمی و ادبی ماہنامہ پابندی وقت کے ساتھ تا حال جاری ہے۔ اور اس کے مندرجہ ذیل خصوصی شمارے اور سالنامے ڈاکٹر صاحب کی ادارت میں نکل چکے ہیں۔

۱۔	نیاز فتح پوری نمبر ۱	۱۹۶۳ء
۲۔	نیاز فتح پوری نمبر ۲	۱۹۶۳ء
۳۔	تذکروں کا تذکرہ نمبر	۱۹۶۴ء
۴۔	جدید شاعری نمبر	۱۹۶۵ء
۵۔	اصناف ادب نمبر	۱۹۶۶ء
۶۔	اصناف شاعری نمبر	۱۹۶۷ء
۷۔	مسائل ادب نمبر	۱۹۶۸ء

۸۔ غالب صدی نمبر ۱۹۶۹ء

۹۔ سر سید نمبر ۱ ۱۹۷۰ء

۱۰۔ میر انیس نمبر ۱۹۷۱ء

۱۱۔ سر سید نمبر ۲ ۱۹۷۲ء

۱۲۔ مولانا حسرت موہانی نمبر ۱ ۱۹۷۳ء

۱۳۔ مولانا حسرت موہانی نمبر ۲ ۱۹۷۴ء

۱۴۔ ڈاکٹر محمد حسین نمبر ۱۹۷۵ء

۱۵۔ قائد اعظم نمبر ۱۹۷۶ء

۱۶۔ علامہ اقبال نمبر ۱۹۷۷ء

۱۷۔ مولانا محمد علی جوہر نمبر ۱۹۷۸ء

۱۸۔ قمر زمانی نمبر ۱۹۷۹ء

۱۹۔ مسائل زبان نمبر ۱۹۸۰ء

۲۰۔ اردو افسانہ نمبر ۱۹۸۱ء

۲۱۔ فن تاریخ گوئی نمبر ۱۹۸۲ء

۲۲۔ خطبات محمود نمبر ۱۹۸۲ء

۲۳۔ جشن طلائی نمبر ۱۹۸۳ء

۲۴۔ نیاز صدی نمبر ۱۹۸۴ء

۲۵۔ فن عروض نمبر ۱۹۸۵ء

۲۶۔ مکتوبات نیاز نمبر ۱۹۸۵ء

۲۷۔ تنقید غزل نمبر ۱۹۸۶ء

۲۸۔ غالب بنگاہ نیاز نمبر ۱۹۸۷ء

۲۹۔ اردو شاعری کا فنی ارتقا نمبر ۱۹۸۸ء

۳۰۔ اردو نثر کا فنی ارتقا نمبر ۱۹۸۹ء

۳۱۔ اقبال بنگاہ نیاز نمبر ۱۹۹۰ء

۳۲۔ نقد شعر نمبر ۱۹۹۱ء

۳۳۔ عورت اور فنون لطیفہ نمبر ۱۹۹۲ء

۳۴۔ خدا نمبر ۱۹۹۳ء

تعلیمی، علمی، ادبی اداروں سے وابستگی

۱۔ تقریباً تین سال جامعہ کراچی کے شعبہء اردو سے وابستگی۔

۲۔ ۱۹۶۲ء سے ماہنامہ "نگار پاکستان" کے مدیر اعلیٰ۔

۳۔ پاکستان کی بیشتر جامعات کی مختلف تحقیقی تعلیمی کمیٹیوں کے رکن

۴۔ ملک کے مختلف ٹیکسٹ بک بورڈز کی رہنما کمیٹیوں کے رکن اور کتابوں کے مسودوں کے مرتبین و مبصرین کے کنوینر

۵۔ سیکنڈری اور انٹر میڈیٹ بورڈوں کی اکیڈمک کمیٹیوں کے رکن

۶۔ اکادمی ادبیات پاکستان کی پبلی کیشن کمیٹی کے رکن

۷۔ مقتدرہ قومی زبان کی املا کمیٹی کے صدر

۸۔ پاکستان کی بیشتر جامعات کی پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر کے نگران ممتحن

۹۔ پاکستان کے قومی کتب خانوں کے لئے مخطوطات کی خریداری کمیٹی کے رکن

۱۰۔ قومی سطح کے انعامات و اعزازات دینے والی کمیٹی کے رکن

۱۱۔ مجلس جامعہ تعلیم ملی کی انتظامی کمیٹی کے رکن و نائب صدر

۱۲۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے رکن

۱۳۔ ادارہ یادگارِ غالب کراچی کے رکن اور نائب صدر

۱۴۔ اردو سائنس بورڈ لاہور کی ہیئت حاکمہ کے رکن

۱۵۔ علامہ اقبال اکیڈمی لاہور کی ہیئت حاکمہ کے رکن

۱۶۔ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے بورڈ آف گورنرز اور مجلس انتظامیہ کے رکن

۱۷۔ مزار قائداعظم کتبہ کمیٹی کے رکن

۱۸۔ فنی اصطلاحات کے تراجم کی نگرانی اور معیار مقرر کرنے والی قومی کمیٹی کے رکن

۱۹۔ فتح پور ایجوکیشنل سوسائٹی (رجسٹرڈ) کے معتمد عمومی اور رکن

۲۰۔ اردو لغت بورڈ کے مدیرِ اعلیٰ اور سیکریٹری

غیر ممالک کی سیاحت

امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، اٹلی، جرمنی، فرانس، سعودی عرب، چین، مسقط، خلیج فارس، بھارت

اعزازات واعترافاتِ عظمت:

۱۔ صدرِ اسلامی جمہوریہ پاکستان نے ۱۹۸۵ء میں غیر معمولی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں "ستارۂ امتیاز" کے اعزاز سے سرفراز کیا۔

۲۔ پاکستانی جامعات کے پہلے پروفیسر ہیں جو اردو زبان وادب سے متعلق بیک وقت پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں رکھنے کا اعزاز رکھتے ہیں۔

۳۔ کراچی یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے پانچ بار نقد انعامات کی صورت میں تحقیقی کاموں کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔

۴۔ دو بار رائٹرز گلڈ آف پاکستان کی طرف سے داؤد ادبی ایوارڈ کے مستحق قرار پائے ہیں۔

۵۔ ایک درجن سے زائد ریسرچ اسکالر ان کی نگرانی میں تحقیقی کام کرکے پی ایچ ڈی

کی ڈگریاں لے چکے ہیں۔

۶۔ کراچی، ملتان، بہاولپور، حیدرآباد، بلوچستان، اسلام آباد، اور پاکستان کی دوسری جامعات کے متعدد ریسرچ اسکالرز آج بھی ان کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کے لئے تحقیقی کام کر رہے ہیں۔

۷۔ ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال کے صد سالہ جشنِ ولادت کے موقع پر حکومت پاکستان نے علامہ اقبال پر ایک ایسی مستند اور جامع کتاب لکھنے پر مامور کیا جس میں علامہ کی زندگی اور فکر و فن کا مکمل احاطہ کیا گیا ہو۔ سات سو صفحات کی یہ کتاب "اقبال سب کیلئے" کے نام سے حکومتِ پاکستان کی جانب سے شائع کی گئی۔ اس کے متعدد ایڈیشن اب تک نکل چکے ہیں۔ ہندوستان سے بھی شائع ہو چکی ہے۔

۸۔ ۱۹۷۶ء میں قائداعظم کے صد سالہ جشنِ ولادت کے موقع پر بھی حکومتِ پاکستان نے موضوع دے کر ایک کتاب لکھوائی جو "ہندی اردو تنازع" کے عنوان سے چھ سو صفحات میں انگریزی اور اردو دونوں زبان میں شائع ہوئی ہے۔ کئی بار چھپی اور زبان کے حوالے سے تحریک پاکستان کے بارے میں ایک اہم اور مستند ماخذ قرار پائی۔

۹۔ اردو زبان وادب میں بیک وقت پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی اسناد رکھنے کے سبب کراچی یونیورسٹی کے چانسلر اور گورنر سندھ نے طلائی تمغہ عطا کیا۔

۱۰۔ معروف فلاحی ادارے "تنظیم برادران پاکستان" کی جانب سے ۱۹۸۷ء کا ادبی ایوارڈ دیا گیا۔

۱۱۔ ۱۹۸۸ء میں کراچی کے شہریوں کی طرف سے ڈی۔ ای۔ پی ادبی ایوارڈ کے ذریعے ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔

۱۲۔ ۱۹۸۹ء میں "یونی کیرین" یونیورسٹی آف کراچی کی جانب سے نشانِ فضیلت کی

سند دی گئی

۱۳۔ ۱۹۹۰ء میں جشن فیض کمیٹی کی طرف سے "فیض احمد فیض" ایوارڈ دیا گیا

۱۴۔ ۱۹۹۱ء میں "فرسٹ کراچی سٹیزن ایوارڈ" عطا کیا گیا۔

۱۵۔ ۱۹۹۲ء میں "نشانِ سپاس" کی صورت میں ہمدرد یونیورسٹی کراچی نے خدمات کا اعتراف کیا۔

۱۶۔ ۱۹۹۳ء میں برصغیر میں نعت گوئی پر پہلی تحقیقی وتنقیدی کتاب "اردو کی نعتیہ شاعری" کے مصنف ہونے کی حیثیت سے "نعت اکیڈمی ایوارڈ" دیا گیا۔

۱۷۔ ۱۹۹۴ء میں کینیڈین اکیڈمی آف اردو لٹریچر کی جانب سے ٹورنٹو (کینیڈا) میں "انٹرنیشنل اردو ایوارڈ" دینے کا اعلان کیا گیا۔ اسی سال نیویارک میں "جشن فرمان" کا اہتمام کیا گیا۔ اردو کے معتبر اہلِ قلم نے مقالے لکھے۔

۱۸۔ وفاقی وزارت تعلیم حکومت پاکستان کے تحت اردو ڈکشنری بورڈ کراچی میں اردو لغت کی تدوین کے منصوبے پر کام کیا۔

اداریے

تقریباً ۳۵ سال سے ہر مہینے "ملاحظات" کے عنوان سے ماہنامہ نگار پاکستان کے اداریے لکھ رہے ہیں۔ تعداد: تقریباً چار سو

دیباچے اور مقدمات

معاصرین کی تقریباً پچاس کتابوں پر دیباچے مقدمے لکھے جو بذات خود تحقیقی و تنقیدی مقالات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مذاکرے، کانفرنسیں، سیمینار

قومی و بین الاقوامی سطح کے لاتعداد سیمینارز، مذاکروں اور کانفرنسوں میں مقالات پڑھے، صدارتیں کیں، ان جلسوں کی تقریریں اور خطبات بھی خاصی تعداد میں محفوظ ہیں اور کتابی روپ میں آنے کے بعد جو خاصے کی چیز ثابت ہوں گے۔

مقرر

لاتعداد علمی، ادبی تحقیقی اور تنقیدی موضوعات پر اعلیٰ پایہ کی تقاریر کشش مزید کی باعث!

ڈاکٹر فرمان پوری بطور "موضوع"

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شخصیت اور فن کے بارے میں مندرجہ ذیل کتابیں مرتب کی جا چکی ہیں:

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری شخصیت اور ادبی خدمات
مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم دہلی ۱۹۹۱/ کراچی ۱۹۹۳ء

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: حیات وخدمات (۳ جلدیں)
مرتبہ امراؤ طارق۔ کراچی ۱۹۹۶ء

۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: احوال وآثار
مرتبہ ڈاکٹر طاہر تونسوی۔ لاہور: ۱۹۹۸ء

۴۔ کتاب سے پہلے (مطبوعات ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے منتخب دیباچے)
مرتبہ ڈاکٹر نجیب جمال۔ لاہور ۱۹۹۶ء

جامعات میں ایم اے اردو اور ایم فل کی سطح کے تحقیقی مقالات:

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری بحیثیت نقاد
از۔ محمد نذیر انور علوی بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان ۱۹۸۷ء

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری بحیثیت محقق
از۔ نورین فردوس گورنمنٹ کالج لاہور: ۱۹۹۰ء

۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور اقبال شناس
از۔ سہیل سرور گورنمنٹ کالج لاہور: ۱۹۹۶ء

۴۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور غالب شناس
از۔ سیدہ واضح وحید گورنمنٹ کالج لاہور: ۱۹۹۶ء

۵۔ نگار پاکستان کی ادبی خدمات (۱۹۶۲ء تا ۱۹۹۳ء)
از۔ محمد نذیر انور علوی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی۔ ایم فل: ۱۹۹۶ء

کتابیات

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحریر کردہ/ مرتبہ کتاب بلحاظ موضوعات:

تحقیق وتنقید

تحقیق وتنقید	دہلی: ۱۹۶۳ء، کراچی ۱۹۶۳، ۱۹۷۷، ۱۹۸۸ء
اردو رباعی کا فنی وتاریخی ارتقا	کراچی ۱۹۶۲ء، لاہور ۱۹۸۲، ۱۹۸۳ء
اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری	لاہور ۱۹۷۲ء
اردو کی نعتیہ شاعری (۹)	لاہور ۱۹۷۳ء
نیا اور پرانا ادب	کراچی ۱۹۷۳ء، ۱۹۹۰ء

فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت	کراچی/ لاہور ۱۹۸۳ء
تاویل وتعبیر	لاہور ۱۹۶۸ء
اردو کی ظریفانہ شاعری	دہلی ۱۹۸۷ء لاہور ۱۹۸۸ء
اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ	کراچی/ لاہور ۱۹۹۰ء
اردو نثر کا فنی ارتقا (مرتبہ)	کراچی، دہلی ۱۹۸۹ء، لاہور ۱۹۹۷ء
اردو شاعری کا فنی ارتقا (مرتبہ)	کراچی، دہلی ۱۹۹۰، لاہور ۱۹۹۷ء
غزل: اردو کی شعری روایت	کراچی ۱۹۹۵ء
ادب اور ادب کی افادیت	کراچی ۱۹۹۶ء
خودنوشت اور تنقید خودنوشت	
(مرتبہ: شریک مرتب امراؤ طارق)	لاہور ۱۹۹۸ء
امراؤ جان ادا (مقدمہ/ مرتبہ)	لاہور ۱۹۸۳ء

مثنویاں

اردو کی منظوم داستانیں	کراچی ۱۹۷۱ء
دریائے عشق اور بحر الحبت کا تقابلی مطالعہ	لاہور ۱۹۷۲ء
نواب مرزا شوق کی تین مثنویاں	
مذہب عشق، بہار عشق، زہر عشق	لاہور ۱۹۷۲ء
اردو کی بہترین مثنویاں	لاہور ۱۹۹۳ء

شخصیات

قمر زمانی بیگم	لاہور ۱۹۷۲ء، کراچی ۱۹۷۹ء
ارمغان گوکل پرشاد (مرتبہ)	کراچی ۱۹۷۵ء

میر انیس: حیات اور شاعری	کراچی ۱۹۷۶ء
ادبیات و شخصیات (خاکے)	لاہور ۱۹۹۳ء
تحریک پاکستان اور قائداعظم	لاہور ۱۹۷۶ء، ۱۹۸۲ء، ۱۹۹۰ء
خطبات محمود (مرتبہ)	لاہور ۱۹۸۳ء
مولانا حسرت موہانی: شخصیت اور فن	لاہور ۱۹۷۷ء
سری پرکاش اور پاکستان	لاہور ۱۹۹۳ء
ڈاکٹر محمود حسین: شخصیت اور کارنامے	کراچی ۱۹۷۶ء
ادا جعفری: فن و شخصیت	
(مرتبہ شریک مرتب امراؤ طارق)	کراچی ۱۹۹۸ء
مولانا جوہر: حیات اور کارنامے	کراچی/لاہور ۱۹۶۹ء، ۱۹۸۸ء
میر کو سمجھنے کیلئے:	کراچی ۱۹۹۹ء
نیاز فتح پوری:	
نیاز فتح پوری: شخصیت اور فکر و فن	کراچی ۱۹۸۶ء
نیاز فتح پوری: دیدہ و شنیدہ	لاہور ۱۹۹۰ء
نیاز شناسی (علامہ نیاز یادگاری خطبات مرتبہ)	لاہور ۱۹۹۷ء

لسانیات

تدریس اردو	کراچی ۱۹۶۲ء، ۱۹۷۲ء، ۱۹۸۵ء
	اسلام آباد ۱۹۸۶ء
زبان اور اردو زبان	کراچی ۱۹۷۳ء، ۱۹۹۵ء
ہندی اردو تنازع	اسلام آباد ۱۹۷۶ء، کراچی ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۸ء

اردو املا اور رسم الخط	
(اصول و مسائل)	کراچی/لاہور ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۰ء، ۱۹۹۳ء
اردو املا اور قواعد: مسائل و مباحث (مرتبہ)	اسلام آباد ۱۹۹۰ء
قومی یک جہتی اردو اور پاکستان	کراچی ۱۹۹۲ء

غالبیات

غالب شاعر امروز و فردا	لاہور ۱۹۷۰ء
تمنا کا دوسرا قدم اور غالب	کراچی ۱۹۹۵ء
اشعار غالب کی تشریح	(غیر مطبوعہ)

نوٹ: ڈاکٹر سید معین الرحمن کے تعارف کے ساتھ اس شرح کے کچھ اجزا گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اردو کے مجلہ "تحقیق نامہ" (۹۸-۱۹۹۷ء) میں طبع ہوئے ہیں (صفحات: ۱۸۷ تا ۲۰۷)

اقبال

اقبال سب کے لیے	کراچی ۱۹۷۸ء، دہلی ۱۹۸۰ء

افسانہ

اردو افسانہ اور افسانہ نگاری	کراچی ۱۹۸۲ء، دہلی ۱۹۸۳ء
اردو کا افسانوی ادب	ملتان/دہلی ۱۹۹۸ء

سفرنامہ

دید و باز دید	ملتان ۱۹۸۳ء

English Books:

Sir Syed Ahmad Khan on present state of Indian Politics.
Lahore,1982

Pakistan Movement and Hindi- Urdu conflict. Lahore,1986

مقالات

تقریباً تین سو تحقیقی و تنقیدی (غیر مدون) مطبوعہ مقالات

تبصرے

تقریباً ۶۰ کتابوں پر مختصر اور طویل تبصرے تحریر کیے۔ طویل تبصرے ''باب الانتقاد'' کے مستقل عنوان سے ماہنامہ ''نگار'' (کراچی) میں شائع ہوئے۔

آپ بیتی

خود نوشت سوانح عمری لکھنے کا ڈول ڈال رہے ہیں۔ نام ابھی طے نہیں کیا۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: ''شخصیت اور ادبی خدمات'' ص: ۷

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: ''حیات و خدمات'' (جلد دوم) ص: ۳۵۱

نوٹ: نیاز فتح پوری فرمان صاحب کی کتاب ''اردو رباعی فنی و تاریخی ارتقا''
(کراچی ۱۹۶۲ء) کے بارے میں اظہار خیال کر رہے تھے۔

۳۔ ایضاً (جلد اول) ص: ۱۵۶

۴۔ ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری: شخصیت و ادبی خدمات'' ص: ۱۷

۵۔ ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری: حیات و خدمات'' (جلد اول) ص: ۱۳۵،۱۳۸

۶۔ ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری: احوال و آثار'' ص: ۲۲۸

۷۔ ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری: حیات و خدمات'' ص: ۱۵۸

۸۔ ''اردو تحقیق یونیورسٹیوں میں'' ص: ۳۸

۹۔ ڈاکٹر ریاض مجید کے بقول:

''نعت کے بارے میں شائع ہونے والی پہلی اہم تصنیف ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''اردو میں نعتیہ شاعری'' (۱۹۷۴ء) ہے جس میں علمی و تحقیقی انداز میں نعت کے فکر و فن کے ضروری پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے'' (اردو میں نعت گوئی صفحہ ن)

۱۰۔ ''میرا بچپن'' ص: ۱۵۸

۱۱۔ ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری: شخصیت اور ادبی خدمات'' ص: ۱۵،۱۱۶

۱۲۔ ''ڈاکٹر فرمان، فتح پوری: حیات و خدمات'' ص: ۶۹۸

۱۳۔ ایضاً ص: ۷۰۵، ۷۰۹، ۷۱۰

۱۴۔ ایضاً ص: ۲۰

۱۵۔ ایضاً ص: ۶۲۔۲۰

۱۶۔ ایضاً ص: ۳۲۶

۱۷۔ ایضاً ص: ۳۳۸

۱۸۔ ایضاً ص: ۷۳۳

۱۹۔ ایضاً ص: ۷۳۶۔۷۳۳

۲۰۔ ایضاً ص: ۷۵۴۔۷۳۶

۲۱۔ مقالہ بعنوان ''غالب، دیوان غالب نسخہ خواجہ اور ڈاکٹر سید معین الرحمن''
مطبوعہ ''ماہِ نو'' لاہور اپریل ۱۹۷۹ء۔

۲۲۔ ''تحقیق نامہ'' ص: ۱۸۳۔۱۷۶

۳۲۔ ''غالب شاعر امروز و فردا'' صفحہ ج